اللہ تعالیٰ کے رحم اور فضل کے ساتھ

ماہنامہ

قندیل ادب

جون 2016ء

مدیر : رانا عبدالرزاق خان

07886304637 & 02089449385

rana_razzaq@hotmail.com

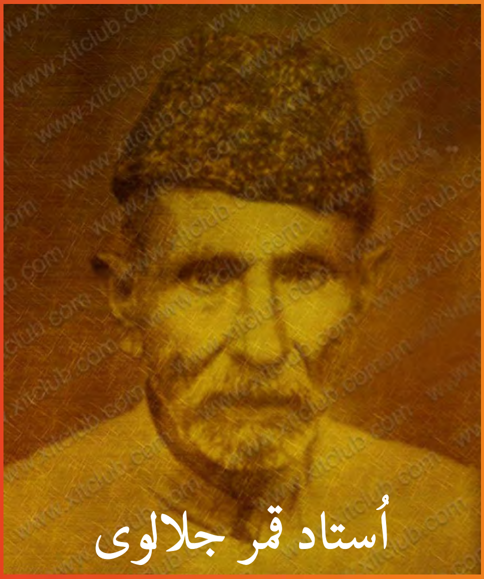

اُستاد قمر جلالوی

کبھی کہا نہ کسی سے ترے فسانے کو
نہ جانے کیسے خبر ہو گئی زمانے کو

دعا بہار کی مانگی تو اتنے پھول کھلے
کہیں جگہ نہ رہی میرے آشیانے کو

مری لحد پہ پروانوں کا خون ہوتا ہے
حضور شمع نہ لایا کریں جلانے کو

اب آگے اس میں تمہارا بھی نام آئے گا
جو حکم ہو تو یہیں چھوڑ دوں فسانے کو

سُنا ہے غیر کی محفل میں تم نہ جاؤ گے
کہو تو آج سجا لوں غریب خانے کو

قمؔر زرا بھی نہیں تم کو خوف رُسوائی
چلے ہو چاندنی شب میں انہیں بلانے کو

www.qindeel-e-adub.com

ماہنامہ
قندیل اَدب اِنٹرنیشنل لندن

مدیر:
رانا عبدالرزاق خان

شمارہ نمبر:42 جون 2016ء

فہرست

نامے جو میرے نام آتے ہیں۔	ادارہ	2
غزلیات :: جگر مراد آبادی، تسلیم الٰہی زُلفی، مضطرؔ عارفی، مختار احمد شاہ جہانپوری، صابر ظفر، عبدالکریم قُدسی، مقصود احمد منیب، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، راحت نسیم ملک، فضل الرحمٰن بشیر، طفیل عامر، ساجد محمود رانا، شفیق مراد، ڈاکٹر راحت اندوری، دلاور علی آزر، مبارک صدیقی، عاصی صحرائی، میر انجم پرویز، آصف محمود ڈار، خواجہ عبدالمومن، مبارک عابد، عبدالمجید ظفر، رمضان شاکر نصیر پوری، اسحاق ساجدؔ (جرمنی)		3-7
رُوحانیت کا موسم بہار رمضان المبارک	رانا عبدالرزاق خان	8
حضرت سلطان باہو اور محمد اقبال		9
میرے وطن کے دانشورو	رانا عبدالرزاق خان	10
ہمارے صاحبانِ تعلیم وتربیت	رانا عبدالرزاق خان	12
کُتّا۔ انشائیہ	امجد مرزا امجد	13
ترقی یافتہ ’’ممالک میں والدین کے ہاتھوں بچوں...	ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔آسٹریلیا	14
نامور ڈرامہ نگار۔خواجہ معین الدین	وسیم باری	15
۳۰۔اپریل کا کوٹلی آزاد کشمیر کا جلسہ پیپلز پارٹی	اے۔آر۔راجپوت	15
تاریخی قرارداد	بلال افتخار	16
شیخ ایاز	محمد ابراہیم عابد	16
حقوق نسواں بل پر حکومت کا گھٹنے ٹیکنا	رجل خوشاب	17
ادباء وشعراء کے لطائف	ثقلین مبارک آسٹریلیا	17
ہائے یہ محب وطن پاکستانی	ابن لطیف	18
ساغر صدیقی (یونس ادیب صاحب کی کتاب ’’شکستِ ساغر‘‘ سے اقتباس)	عاصی صحرائی	20
جگر مراد آبادی	عاصی صحرائی	21
پہلا گناہ	امجد مرزا امجد	22
چیف جسٹس انور ظہیر جمالی کی چشم کشا باتیں	اے آر خان	23
نماز کی اہمیت	حسن نثار	24
ڈاکٹر عبدالغفار عزم پی ایچ ڈی مرحوم	کوثر علی	26
چوراہا	حسن نثار	27
خواب آنکھوں میں ٹوٹ جاتے ہیں	سہیل احمد کی شاعری	28
جستہ جستہ	عاصی صحرائی	29
بزم اردو برطانیہ	(رپورٹ رانا عبدالرزاق خان)	30
تسلیم الٰہی زُلفی کے ساتھ ایک شام	عاصی صحرائی	31
روئیداد تقریب رُونمائی کاسۂ نمناک	مرتبہ: کلیم احمد خان	32-33

مجلس ادارت

زکریا ورک، امجد مرزا امجد، ایم اے حق بھارت، خواجہ عبدالمومن ناروے، آصف علی پرویز

نگرانِ اعلیٰ	:	خان بشیر احمد خان رفیق لندن
مدیر	:	رانا عبدالرزاق خاں
معاون مدیر	:	سید حسن خان
مدیر خصوصی	:	سہیل لون
ڈیزائنر	:	کرشن احمد
مینجنگ ڈائریکٹر	:	عاصی صحرائی
فوٹوگرافی	:	قاضی عبدالرشید، فضل عمر ڈوگر
آڈیو وڈیو	:	محمد اشرف خاکی

اراکین مشاورتی بورڈ

آدم چغتائی، منور احمد کنڈے، رضیہ اسمٰعیل برمنگھم، رند ملک کنیڈا، اسلم ناصر آسٹریلیا، اے حق یو کے ٹائمز، ثقلین مبارک آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بحرین، بشیر احمد خان سویڈن، راجہ منیر احمد، ڈاکٹر منصور خوشتر بھارت، منور احمد خورشید۔

گزارش

ہم سب اہل علم احباب کی خدمت میں گذارش کرتے ہیں کہ اپنے ادبی فن پارے، غزل، نظم، افسانہ، مشاعرے کی روئیداد وغیرہ جو بھی ان پیج میں ارسال کیا جائے گا۔ بلاتفریق اسے معیار کے مطابق شائع کیا جائے گا۔ جو دوست بھیجتے ہیں اُن کی قدر کی جاتی ہے۔قندیل ادب تمام ممالک جہاں اسے قارئین موجود ہیں تقریباً دو لاکھ قارئین تک جاتا ہے اور ویب سائٹ سے بھی پڑھا جاتا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ ہم نادر اور نئی تخلیقات کو اس میگزین میں جگہ دیں۔ اور ہر بھیجنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں، اور اس میگزین کا معیار بھی عوامی کریں۔ ہر ادیب وشاعر، نقاد، افسانہ نگار، اُردو کے خدمتگار کی عزت افزائی کریں۔ ہمیں کوئی صلہ مقصود نہیں۔ اگر آپ نے کوئی کتاب لکھی ہے تو اس کا نام اور تعارف لکھ بھیجیں۔ اگر آپ کے پاس ادبی فن پارہ کوئی نہیں تو اپنے ریمارکس ہی ارسال کردیا کریں تاکہ ہم اپنا محاسبہ کرتے رہا کریں۔ شکریہ۔

رانا عبدالرزاق خاں

نامے جو میرے نام آتے ہیں

محترم بی اے رفیق صاحب رقم طراز ہیں:

بہت ہی اچھا میگزین ہے۔جس میں ادب لطیف بلکہ ہر قسم کا مواد شائع ہوتا ہے۔اس میں شعر وشاعری، شعراء اور ادباء کا تعارف، سیاسی آرٹیکل، دنیا کے حالات حاضرہ، لطائف، طنزیہ تبصرے، کتب پر تبصرے، مشاعروں کی روئیداد، معلوماتی مضامین سے مزین ہوتا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

محترمہ کوثر علی صاحبہ ماہر تعلیم لندن:

فرماتی ہیں یہ میگزین دیارِ غیر میں ایک نعمت سے کم نہیں۔اس نے دیارِ مغرب میں اُردو کو زندہ رکھا ہوا ہے۔اس میں پڑھنے کو بہت کچھ مل جاتا ہے۔اللہ آپ کی یہ خدمت قبول کرے۔

محترم شفیق مراد جرمنی فرماتے ہیں:

بہت اچھی کاوش ہے جاری رکھئے۔اُردو زبان کی خدمت کر کے آپ ہمدردانِ اُردو کے مقام پر فائز ہیں۔

محترم تسلیم الٰہی زُلفی کنیڈا سے فرماتے ہیں:

آپ یہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں جو کہ بے لوث ہے اور اُردو زبان کی خدمت ہے۔آپ کا کام قابل تحسین ہے۔

قندیل ادب انٹرنیشنل کی جانب سے قارئین کو ماہِ رمضان کی مبارکباد

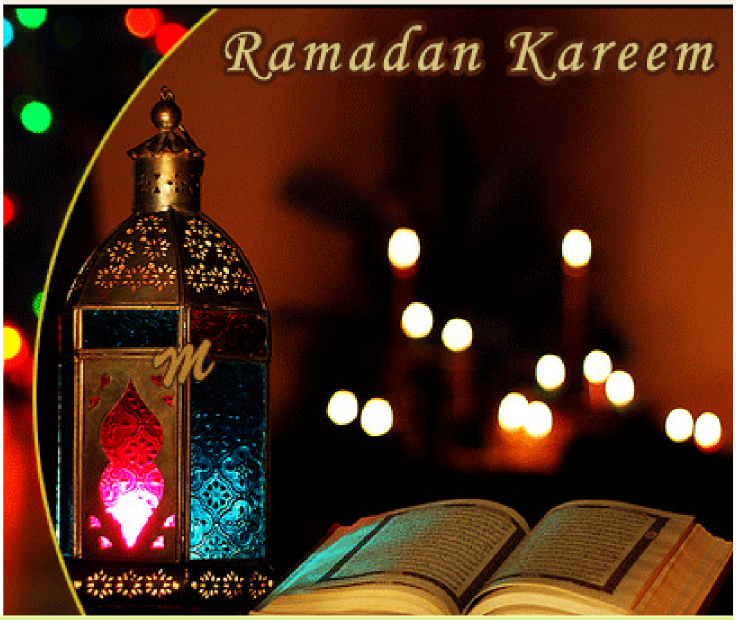

روزہ کے 20 بیس فوائد

(ادارہ)

☆ تقویٰ جیسی نعمت عظمیٰ حاصل ہوتی ہے۔
☆ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق ملتی ہے۔
☆ امراض روحانی دور ہوتی ہیں۔جیسے گرسنگی سے جسمانی امراض دور ہوتے ہیں۔
☆ مشقت برداشت کرنے کی عادت پڑتی ہے۔
☆ عفت و پاک دامنی حاصل ہوتی ہے۔
☆ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔
☆ تہجد ادا کرنے کی توفیق ملتی ہے۔
☆ نوافل پڑھنے کی توفیق ملتی ہے۔
☆ علوم قرآنی کا انکشاف ہوتا ہے۔
☆ ترک اکل وشرب سے ملائکہ سے مشابہت پیدا ہوتی ہے۔
☆ عقل انسانی کو نفس امارہ پر تسلط وغلبہ تامہ ہوتا ہے۔
☆ قوت ارادی بڑھتی ہے۔
☆ تہجد و نوافل پر مداومت حاصل ہوتی ہے۔
☆ صبح سویرے اٹھنے سے طبیعت میں بشاشت پیدا ہوتی ہے۔
☆ کھانا کھانے کے اوقات میں باقاعدگی سے صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔
☆ غرباء کی تکلیف کا احساس پیدا ہو کر ان سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔
☆ ترک لغویات کی توفیق ملتی ہے۔
☆ قبولیت دعا کے نظاروں سے زندہ ایمان حاصل ہوتا ہے۔
☆ تعمیل ارشاد الٰہی سے سرور وانبساط پیدا ہوتا ہے۔
☆ جنت کا قرب اور اس میں نمایاں اور خاص مقام حاصل ہوتا ہے۔

غزل

جگر مراد آبادی

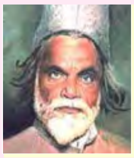

دل کی خبر نہ ہوش کسی کو جگر کا ہے
اللہ اب یہ حال تمھاری نظر کا ہے
اس سمت دیکھتی بھی نہیں رُخ جدھر کا ہے
سب سے جدا اُصول تمھاری نظر کا ہے
سب رَفتہ رَفتہ داغ اَلم دے گئے مگر
محفوظ ہے وہ زخم جو پہلی نظر کا ہے
میرے دلِ حزیں میں کہاں تابِ اِضطراب
جو کچھ کمال ہے وہ تمھاری نظر کا ہے
کس طرح دیکھوں جلوۂ جاناں کو بے حجاب
پردَہ پڑا ہوا مرے آگے نظر کا ہے
پیہم ہجوم یاس سے آتا نہیں یقین
تم میرے سامنے ہو یا دھوکا نظر کا ہے

تسلیم الٰہی زُلفی

پہلے سینے کے اندھیرے میں چراغاں ٹھہرے
بعد اُس کے مرے گھر میں کوئی مہماں ٹھہرے
ہے فصیل اُونچی بہت، بند ہے دروازہءِ شہر
اب کہاں قافلہ خانہ بدوشاں ٹھہرے
اپنے اسباب میں،اک بے سروسامانی تھی
رُوح کے چاروں طرف جسم کے ہنگامے ہیں
ایسے پتھراؤ میں کیا آئینۂ جاں ٹھہرے
شہر میں قحط ہے اب بخیہ گروں کا زُلفی
اپنے ہاتھوں میں ذرا، اپنا گریباں ٹھہرے

دعا تو دل سے مانگی جاتی ہے، زبان سے نہیں
اے اقبال
قبول تو اس کی بھی ہوتی ہے، جس کی زبان نہیں ہوتی

مضطر عارفی

وہ اسم اگر تحریر کروں
اسے پلکوں سے تصویر کروں
چڑھ جاؤں ستم کی سولی پر
کوئی جینے کی تدبیر کروں
مَیں اندر باہر سے ڈھل کر
جس کو چھو دوں ، اکسیر کروں
صدیوں کی ہجر حکایت کو
دل دامن پر تحریر کروں
جب صدیاں لمحے بن جائیں
مَیں لمحوں کو زنجیر کروں
وہ میرا ہے، مَیں اس کا ہوں
کیوں فکر کو دامن گیر کروں
سچا ہوں اگر تو خوف ہے کیا
کوئی ”جرم“،کوئی ”تقصیر“ کروں
آیت کی طرح اس چہرے کو
پڑھ لوں تو کوئی تفسیر کروں
اسی صورتِ زیبا کو چاہوں
اس زلف کی آنکھ اسیر کروں
اس پھول کے رنگ اعلان کروں
اور خوشبو کی تشہیر کروں
وہ خواب جو اُس نے دیکھا تھا
اس خواب کی کیا تعبیر کروں
اس خواب کے پورا ہونے تک
کوئی خواب محل تعمیر کروں
ممکن ہے کہ پردہ اُٹھنے تک
دوچار گھڑی تاخیر کروں
ہو اِذن تو اپنی غزلوں کو
مستقبل کی جاگیر کروں
مَیں پیار کی دولت بانٹتا ہوں
مجھے حکم ہے دل تسخیر کروں
شاید کوئی سننے والا ہو
صحرا مین کھڑا تقریر کروں
وہ رہبر کامل عہد کا ہے
مضطرؔ! مَیں جس کو پیر کروں

محترم مختار احمد شاہ جہان پوری

وہ تنکے نام جن کا آشیاں ہے
انھیں پر اب نگاہِ آسماں ہے
درازیِ شبِ غم اللہ اللہ
کہ جو تارا جہاں تھا وہ وہاں ہے
تم اب مجھ پر سمجھ کر وار کرنا
خدا میرے تمہارے درمیاں ہے
جگر کی ٹیس یا دل کی خلش ہو
وہ اپنا ہاتھ رکھ دیں پھر کہاں ہے
علاجِ درد کرتے یا نہ کرتے
مگر وہ پوچھ تو لیتے کہاں ہے

صابر ظفر

اُس رُوح نے پکارا ہے لازم ہے جاؤں میں
جاگے اگر نصیب تو واپس نہ آؤں میں
جانا تو خیر آگے ہے لیکن جو اِذن ہو
زیرِ قناعت عشق ذرا بیٹھ جاؤں میں
کافی ہے عمر بھر کے لئے ایک سجدہ ہی
کافر مجھے سمجھنا اگر سر اُٹھاؤں میں

تجھ سے ملے بغیر پرستش تری کراؤں
دیکھوں نہ لو چراغ کی اور لو لگاؤں میں
کچھ اور زندگی سے نہیں چاہیے مجھے
جب تک چلے یہ سانس تجھے دیکھ پاؤں میں
میں کر رہا ہوں خونِ شہیدانِ زفرق طفل
اب تو ہے اس زمیں کا واربتاؤں میں
تم نے پہاڑ کو بھی فراری سمجھ لیا
یہ تو بلوچ ہے اِدھر آؤ دکھاؤں میں
پوری ظفؔر ہو کاش یہ چھوٹی سی آرزو
آزاد ہونے والوں کا پرچم اُٹھاؤں میں

عبدالکریم قدسی

تمہاری ہاتھ کی سطریں ہیں پیرہن میرا
تمہاری یاد سے آباد شہرِ فن میرا
خلوص و پیار سے اہل وطن کو بھیجتا ہے
محبتوں کے تحائف چلا وطن میرا
زمینِ دل پہ تخاطب کے پھول کھلتے ہیں
ترے خطوں سے مہکتا رہے چمن میرا
تری نظر کا ہے فیضان ورنہ میں کیا ہوں
ترے کرم کا ہے مقروض فکر و فن میرا
وفا کے رن میں لگا دوں گا جان کی بازی
یہی ہے عہد مرا اور یہی وچن میرا
چلو کہ ہاتھ اُٹھائیں دعا کریں قُدسی
عجیب موسموں کی زد میں ہے وطن میرا

مقصود احمد منیب

کہیں سائے تھے کچھ پھیلے ہوئے سے
کہیں سورج بدن ڈھکے ہوئے سے
کھڑے تھے دُھوپ کے سائے میں تھک کر
بدن ہر دل کے تھے دُکھے ہوئے سے

معطّر ہو گئیں ساری فضائیں
ہمارے زخم تھے مہکے ہوئے سے
جو کہتا تھا وہ ہو جاتا تھا اکثر
اگرچہ بال تھے بکھرے ہوئے سے
ضروری ہو گئی تھی گفتگو بھی
دلوں کے رَبط تھے ٹوٹے ہوئے سے
دل و جاں کو تسلی کیسے دیتے
زمیں کے سانس تھے اُکھڑے ہوئے سے
بھنور میں دیدہ و دل پھنس گئے تھے
تو کچھ پتوار تھے بکھرے ہوئے سے
جو ہم چلنے لگے تو یاد آیا
ہمارے پیر تھے ٹوٹے ہوئے سے
زمانہ ہم سے کچھ تو مانگتا تھا
زمانے بھر پہ تھے چھائے ہوئے سے

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

دکھ کے لمحوں میں مرا ایک سہارا ماں ہے
میں اگر ڈوبتی کشتی ہوں کنارا ماں ہے
اُس کے قدموں میں جو جنت ہے تو مطلب یہ ہے
آسمانوں سے جسے رَب نے اُتارا ماں ہے
خوشبو ایسی کہ مری رُوح تلک مہکی ہے
روشنی ایسی کہ بس نور کا دھارا ماں ہے
تپتے صحراؤں میں کس طرح بھٹک سکتی ہوں
مجھ کو جو راہ دکھائے وہ ستارہ ماں ہے
اُ س کے ہر دکھ کو میں لفظوں میں سموتی کیسے
میں نے اشکوں سے بس اک لفظ اُبھارا ''ماں'' ہے
سب نے پوچھا کہ بھنور سے تُو بچے گی کیسے
میں نے بے ساختہ نجمہ یہ پکارا ''ماں'' ہے

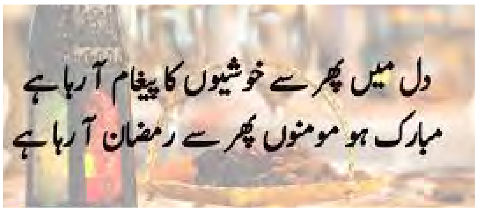

راحت نسیم ملک

عمر تو شاید کٹ جائے گی، آج کی رات کٹے تو جانیں
نیند کا بوجھ تو آنکھ سے اُترا، دل کا بوجھ ہٹے تو جانیں
بارش کے نم ہونٹ ابھی تک صحراؤں کے ہونٹوں پر ہیں
ریت ابھی کتنی پیاسی ہے، پیاس کا اَبر چھٹے تو جانیں
کوہِ ندا کو جانے والے اندھی دُھند میں چلتے ہیں
تنہا ہے یا ساتھ ہے کوئی، راہ کی دُھند چھٹے تو جانیں
سورج کی اُمید میں سارے شہر نے شمعیں گل کر دیں
صبح کا تارا ڈوب رہا ہے، پو بھی ساتھ پھٹے تو جانیں
لکھنے والے ہم نے مانا اوروں کا دُکھ بانٹتے ہیں
اک دن یونہی لکھتے لکھتے اپنا درد بٹے تو جانیں

فضل الرحمٰن بشیر

سکوتِ شب میں تمنائے چشمِ تر بولے
تو کیوں نہ رُوح و بدن کا وہ ہمسفر بولے
یہ جسم کیا ، میری جاں بھی نثارِ جنبشِ لب
میں منتظر ہوں کہ کب صاحبِ امر بولے
لٹک رہا ہوں میں کب سے صدا کی سُولی پر
جو چپ ہوا کبھی ناصح تو چارہ گر بولے
حریفِ صوت وصدا کو جنوں کہ میں نہ رہوں
مجھے ہوس، سرِ مقتل مرا ہنر بولے
فلک نے دے دی گواہی ہزار سال کے بعد
ادائے فرضِ امانت کو بحر و بر بولے
بچا کے رکھ لی ہے ہم نے تو آبروئے وفا
اگرچہ شہرِ ملامت میں شور و شر بولے
نہیں ہے شکوہِ یاراں مگر یہ حسرت ہے
کوئی تو سنگ اُٹھائے کوئی تبر بولے
ہے نطق ولب کی یہ بخیہ گری بھی لا حاصل
میں چپ ہوا تو گماں ہے کہ شہر بھر بولے

طفیل عامر

دُور یا قریب سے پکارو بھی
ماردینا ہے اگر تو مارو بھی
خواب ہے تو خواب بھی کب تلک
! چاند کو زمین پر اُتارو بھی
! نہیں ہے کوئی چارہ تو کرو گے کیا
گزرتی ہے یہ جس طرح گزارو بھی
ہو کسی کے گر غلام تو ہے خیر
زندگی تو اپنی ہے سنوارو بھی
مفہوم بھی سمجھتے ہیں نگاہوں کا
! وارنی ہے جان تو اب وارو بھی
دلکشی بھی خدا کی دین ہے
رُوپ گر نکھرتا ہے، نکھارو بھی
جیت ہی جانا نہیں عامرؔ ضرور
ہو سبب کوئی اگر ہارو بھی

ساجد محمود رانا

یوں نہیں مجھ کو ستاؤ جاؤ
اپنے دکھ درد اُٹھائے جاؤ
کس لئے میں نے بجھایا ہے چراغ
یہ کہانی نہ سناؤ جاؤ
یونہی سورج سے شکایت نہ کرو
اپنی دیوار گراؤ جاؤ
یار کی یار پہنے پائل
دشت میں رنگ جماؤ جاؤ
اب ہواؤں پہ کوئی نام لکھو
اور طوفان اُٹھاؤ جاؤ
وہ جنہیں کچھ بھی نظر نہیں آتا
آئینہ اُن کو دکھاؤ جاؤ
خود ہی خواب چراؤ ساجدؔ
خود ہی اب شور مچاؤ جاؤ

شفیق مراد

رُموزِ عشق سے وہ بہرہ مند کر دے گا
مرے وجود کو اک روز قند کر دے گا
نقاب چہرے سے اپنے ہٹائے گا اک دن
پھر اپنی ذات سے وہ بہرہ مند کر دے گا
وہ مجھ پہ کر کے غضب کی عنائتیں یارو
حصارِ فکر میں پھر مجھ کو بند کر دے گا
مجھے نکال کے تشہیر بھی کرے گا مری
وہ میرے نام کو یونہی بلند کر دے گا
وہ گفتگو کا سلیقہ بھی مجھ سے سیکھے گا
پھر اپنے لہجے میں وہ مجھ کو بند کر دے گا
اس ایک آس پہ بیٹھا ہوں اُسکی چوکھٹ پر
کبھی تو چھو کے مجھے ارجمند کر دیگا
کرے گا خاک مجھے اپنی چاہتوں میں مرادؔ
عنائتیں وہ کبھی مجھ پہ چند کر دے گا

ڈاکٹر راحت اندوری

گلاب، خواب، دوا، زہر، جام، کیا کیا ہے؟
میں آ گیا ہوں، بتا انتظام، کیا کیا ہے؟
فقیر، شاہ، قلندر، امام، کیا کیا ہے؟
تجھے پتہ نہیں کہ تیرا غلام، کیا کیا ہے؟
امیر شہر کے کچھ کاروبار یاد آئے
میں رات سوچ رہا تھا کہ حرام کیا کیا ہے؟
میں تم کو دیکھ کر ہر بات بھول بیٹھا ہوں
تم ہی بتاؤ مجھے تم سے کام کیا کیا ہے؟
زمیں پر سات سمندر سروں پر سات آکاش
میں کچھ نہیں ہوں مگر اہتمام کیا کیا ہے؟

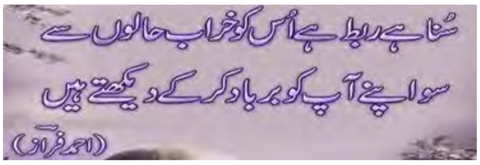

دلاور علی اَزر

موج در موج مری راہ میں اَنگ آتا ہے
میں وہ دریا ہوں جسے بہنے کا ڈھنگ آتا ہے
سال با سال خزاں جھیلنا پڑتی ہے یہاں
مُدتوں بعد کسی شاخ پہ رنگ آتا ہے
سوچتے سوچتے ہوتی ہے وہ صورت معدوم
دیکھتے دیکھتے آئنے میں زنگ آتا ہے
ذکر کیوں کیجے اگر ذکر نہیں اس قابل
بات کیوں کیجے اگر بات میں لنگ آتا ہے
بے نیازانہ گزرتے ہیں فقیر اس رہ سے
نام جاتا ہے نہ اس عشق میں ننگ آتا ہے
اس خرابے میں جو رہتے ہیں خبر ہے اُن کو
ناگہاں قافلۂ تیر و تفنگ آتا ہے
اَزرؔ اس ہجر کے دوران کھلا ہے کہ یہ جسم
سانس لینے کی یہ مشقت سے بھی تنگ آتا ہے

مبارک صدیقی

دُشمنوں سے بات ہم سے یاریاں
چھوڑ دے اے دوست یہ فنکاریاں
یہ بھی سچ ہم دار پر کھینچے گئے
یہ بھی سچ آتی نہ تھیں غداریاں
چھو رہی ہے زُلف اُنکے گال کو
چل رہی ہیں میرے دل پہ آریاں
مجمع اغیار میں، مت حال پوچھ
کچھ تو رہنے دے نا پردہ داریاں
اب یہ کچی اور پکی کیا ہوئی
یاریاں ہوتی ہیں لوگو یاریاں
بعد تیرے عمر بھر ملتی رہیں
تہمتیں، تنہائیاں، دشواریاں

ڈھونڈتا تھا ایک پاگل شہر میں
بے غرض ہمدردیاں، غمخواریاں
میرے پاؤں میں تھے مجبوری کے جال
وہ سمجھتا تھا میں لارے لاریاں
کامیابی ہے، دعا کے ساتھ
اُنکی ہیں آپس میں رشتہ داریاں
دُشمنِ جاں سوچ لے پھر سوچ لے
ایک دن آنی ہیں میری واریاں
مجھ سے پتھر کو گہر سمجھے ہیں لوگ
اے مرے مولا تری ستاریاں
آج بھی تو نے اگر نہ داد دی
میں تری محفل سے اُٹھ کر جا ریاں

عاصی صحرائی

یہ موسمِ وحشت ہے یا فصلِ بہاراں ہے
جس گل پہ نظر ڈالو ، وہ چاک گریباں ہے
ساقی تری محفل میں، ہر رند پریشاں ہے
یہ جام کی گردش ہے، یا گردشِ دوراں ہے
احساس ترے غم کا، کیا نورِ بداماں ہے
اشکوں سے شبِ فرقت، اک جشنِ چراغاں ہے
لرزاں ترے آبا سے، ابلیس کا ایواں ہے
اے پیرِ حرم بتلا، تو بھی تو مسلماں ہے
جو امن کا خواہاں تھا، وہ جنگ بداماں ہے
اے کشمکشِ دوراں، یہ بھی ترا احساں ہے
اک طرفہ تماشا ہے، دنیائے محبت بھی
دیکھو تو گلستاں ہے، سمجھو تو بیاباں ہے
جھکنے میں شجر کے بھی، ہے شیخ سبق مضمر
ہے جس پہ ثمر جتنا ، اتنا ہی وہ گریاں ہے
ہم اپنی تباہی کا ، الزام دھریں کس پر
اس دور کا انساں ہی ، غارتگرِ انساں ہے
ہر موجۂ سرکش سے، کہدو کہ سنبھل جائے
کشتی میں سوار آج اک، پروردۂ طوفاں ہے
دل میرا لرزتا ہے، موجوں کی خموشی پر
طوفان کے آنے کا، اب اور بھی اِمکاں ہے
عاصؔی یہیں رہتا ہے، وہ رشکِ قمر شاید
اس کوچے کا ہر ذرّہ، خورشید بداماں ہے

میرا انجم پرویز

مشرق سے طلوع ہونے والے
مغرب کی نماز پڑھ رہے ہیں
پستی کی کتھا عمل سے لکھ کر
افراز افراز پڑھ رہے ہیں
خود ہی سبق فریب کاری
از نو سر باز پڑھ رہے ہیں
راتوں کو رقیب ہائے یک چشم
سر بستہ راز پڑھ رہے ہیں
پھر مکتبِ عشق میں اکیلے
محمود و ایاز پڑھ رہے ہیں
نغموں میں ڈھلے ہوئے غموں کو
اک سوز سے ساز پڑھ رہے ہیں
سنگلاخ زمین وہ نکالی
حیران اُستاذ پڑھ رہے ہیں

آصف محمود ڈار

اُردو زبان

میں غلامِ مسیحِ زماں ہوگئی
ہے حقیقت کہ میں جاوداں ہوگئی
تیری خدمت میں حاضر ہوئی جب سے میں
تب سے عرب و عجم کی زباں ہوگئی
وہ خزائن جو صدیوں سے مدفون تھے
اُن خزائن سے میں ضو فشاں ہوگئی
سب زبانوں کی جامع ہوئی بے گماں
تیری برکت سے میں گل فشاں ہوگئی
تب اکیلی تھی میں گو وطن میں ہی تھی
تیری خدمت سے میں بے کراں ہوگئی
تو ہے سلطان تحریر و تقریر کا
میں خوش بخت تیری زباں ہوگئی
فکر جتنی تھی مجھ کو دُھواں ہوگئی
ہر فضلیت کا زندہ نشاں ہوگئی
مجھ کو بویا فقیروں نے تیرے لئے
تیری تحریر سے میں جواں ہوگئی
میرو غالب نے سینچا تھا مجھ کو کبھی
تجھ کو پایا، میں رشکِ جناں ہوگئی
پیشگوئی تھی جو نشرِ صحائف کی جو
اُس کا میں بھی تو زندہ نشاں ہوگئی

خواجہ عبدالمومن

محبت کا جو اک پودا لگا ہے
بپا اس سے دلوں میں ولولہ ہے
مرے دل کا جو مسکن بن چکا ہے
وہی ہے جو کہ محبوبِ خدا ہے
بہت دنیا کے گلشن میں نے دیکھے
مگر میرا چمن اس کی رضا ہے
حقیقی عشق کی ہے اور لذت
جسے ہو جائے وہ ہی جانتا ہے
اسیرِ عشق ہوں میں جس کا مومنؔ
مِرا ہر دم اسی سے رابطہ ہے

مبارک عابد

مسافر تھے مگر ہم اس گلی میں عمر بھر ٹھہرے
یقیں پھر بھی یہی ہے ہم جو ٹھہرے مختصر ٹھہرے
یہ چاہت ہے کہ سارا شہر اس دہلیز پر ٹھہرے
اور ہر اک موجۂ فصلِ بہاراں اس کے گھر ٹھہرے
وہ کوئی چاند سورج ہے کہ تارا فیصلہ کرلیں
اسے کہنا ابھی کچھ دیر تک وہ بام پر ٹھہرے
اگر وہ بزم آرا ہو تو حسنِ انجمن اس سے
اگر گرمِ سفر ہو تو جمالِ رہگزر ٹھہرے
مرے ویرانۂ دل میں تمہارا نام ہے جیسے
کسی بے پات ٹہنی پر کوئی تنہا ثمر ٹھہرے
لگن ہے مَن میں سورج کی تو اُس کے ساتھ چلنا ہے
نہ ہم ٹھہریں کہیں پر اَب نہ کوئی ہم سفر ٹھہرے
یہ اہلِ فن بجا کہ مفلس و نادار ہیں لیکن
ہر ایک تاریخ میں اُن کا کہا ہی معتبر ٹھہرے
ہماری آنکھ کا پانی بھی عابدؔ جب لہو بن کر
قلم کی آنکھ سے ٹپکے تو پھر لعل و گہر ٹھہرے

وہی آشیاں - عبدالمجید ظفر

کبھی ہم بھی تھے یونہی محترم کبھی ہم بھی اہلِ وقار تھے
یہیں ساتھ ساتھ تھیں بستیاں جہاں ہم بھی اہلِ دیار تھے
پھر کیا ہوا کہ ہوا چلی رُخ بادباں کے پلٹ گئے
رہی کشتیاں نہ ہی ناخدا نہ ہی وہ جو اُن میں سوار تھے
کچھ تو بتاؤ بلبلو! گلشن میرے کی داستاں
چُن چُن کے کس نے چُن لیے وہی گل جو فخرِ بہار تھے
ہو کے مبتلا تیرے عشق میں ہوشِ جاں رہی نہ قرارِ دل
تجھے کیا کہوں میری خامشی اَرماں جی میں تو بے شمار تھے
نہ ہو بدگماں میری جانِ جاں وہی پیڑ ہے وہی آشیاں
جھولا نما وہی ڈالیاں تیری ہر خوشی پہ نثار تھے
ہم نے کہا تم ہو وہی اُس نے کہا تم وہ نہیں
ہم ہو گئے نادم ظفرؔ سمجھے کہ وہ دلدار تھے

رمضان شائق نصیرپوری

سبھی مجھ سے ہی کہتے ہیں کہ اپنی پہچان بدل ڈالو
اسلاف کی روش کو اور اپنا ایمان بدل ڈالو
میں کہتا ہوں یہ مشورہ تم اپنے پاس ہی رکھو
جو کرنے کو کہتے ہو خود کرو اور میزان بدل ڈالو
اگر خطا جاتے ہیں تمہاری دعاؤں کے تیر پھر
دعاؤں کے اسلوب اور دل کی کمان بدل ڈالو
گوہرِ مقصود پھر بھی حاصل نہ ہو تو پھر!
جہادِ نفس سے کرو اور مچان بدل ڈالو
کوششیں بے کار جائیں اور منزل نہ ملے
رستہ چھوڑ دو یا امیرِ کارواں بدل ڈالو

اسحاق ساجدؔ (جرمنی)

چھوڑ مری برباد تمنا بات نہ کر میخانے کی
ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا دل کیا قیمت پیمانے کی
ارمانوں کا خون بہاکرتے درسے لوٹ چلے
راہ نہ جب مل پائی کوئی ترے دل تک جانے کی
چھوڑ مری برباد تمنا بات نہ کر میخانے کی
غم کے بیچ بھنور میں ہائے تنہا مجھ کو چھوڑ چلے
کیوں قسمیں کھائی تھیں کشتی ساحل تک پہنچانے کی
چھوڑ مری برباد تمنا بات نہ کر میخانے کی
دل کا شیشہ چوٹ سے غم کی کیسا چکنا چور ہوا
نادانی میں کوشش کی تھی پتھر کو پگھلانے کی
چھوڑ مری برباد تمنا بات نہ کر میخانے کی
کتنے آنسو کتنی آہیں کتنی یادیں کتنے غم
سوغاتیں ہیں تنہائی میں اپنا جی بہلانے کی
چھوڑ مری برباد تمنا بات نہ کر میخانے کی
کس کا شکوہ کیسا ماتم کس کی حسرت کیسا غم
افسانہ پھر افسانہ ہے کیا قیمت افسانے کی
چھوڑ مری برباد تمنا بات نہ کر میخانے کی
دنیا کا تو ہوش ہی کیا ہے خود سے بھی بیگانہ ہوں
خوب سزا پائی میں نے بھی تم پر دل آجانے کی
چھوڑ مری برباد تمنا بات نہ کر میخانے کی

رانا عبدالرزاق خان

رُوحانیت کا موسم بہار رمضان المبارک

روزہ ایک روحانی عبادت ہے جس سے روح میں قوت پیدا ہوتی ہے۔انسان کے اخلاق میں بہتری، اس کے خیالات میں جلا، اور اس کی قلبی کیفیات میں نور پیدا ہوتا ہے۔ روزہ روحانی ورزش کا ایک بہترین طریقہ ہے۔قرآن مجید کا نزول اسی مبارک مہینہ میں ہوا تھا۔اور اس کی بکثرت اور خصوصی تلاوت اس ماہ میں ہوتی ہے۔اس کے برکات سے اہل ایمان بہرہ ور ہوتے ہیں۔رمضان کا مہینہ روحانی رنگ میں موسم بہار کا حکم رکھتا ہے، ایمان کے شگوفے کھلتے ہیں۔پھول اور پھل لگتے ہیں۔دلوں میں سرسبزی و شادابی پیدا ہوتی ہے۔مبارک وہ جو اس مبارک مہینہ کی برکات سے پورے طور پر فائدہ حاصل کریں۔

کِشت ایمان کی آبیاری جن قربانیوں سے ہوتی ہے۔قصر دین جن بنیادوں پر اُستوار ہوتا ہے۔خزانہ روحانیت کی حفاظت جن مضبوط پہریداروں سے ہوتی ہے۔ان میں سے ایک زبردست بنیاد اور محکم ذریعہ روزہ ہے۔بعض روحانی امراض کا علاج صرف روزہ ہے۔انجیل میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ مسیحؑ کے شاگرد ایک جن (روحانی بیماری) کو دور نہ کر سکے مسیحؑ نے اسے دور کر دیا۔انہوں نے پوچھا کہ یہ کام ہم کیوں نہ کر سکے؟۔اس پر حضرت مسیحؑ نے فرمایا"اما ھذا الجنس فلا یخرج الا بصلوٰۃ والصوم" کہ یہ قسم بیماری نماز اور روزہ کے بغیر دور نہیں کی جاسکتی۔(عربی انجیل متی ۱۷۔۲۱) روزہ ایسی عبادت ہے جس کے ذریعہ انسان محتاج اور فانی ہونے کے باوجود اپنے رب کے رنگ میں رنگین ہونے کی کوشش کرتا ہے۔وہ ہر دم کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات کا محتاج ہے۔لیکن اپنے آقا کے حکم پر ایک مہینہ بھر کے لئے وہ کھانا پینا ترک کر دیتا ہے۔ازدواجی تعلقات سے پرہیز کرتا ہے۔یہ ایک موثر مجاہدہ ہے اس سے انسان کی روح صیقل ہو جاتی ہے۔اور اس کے بدن میں روحانی کرنیں حلول کرتی ہیں۔درحقیقت تمثیلی زبان میں انسان عاشقانہ انداز میں اعلان کرتا ہے کہ اپنے محبوب آقا کی رضا کے لئے مجھے اپنی جان قربان کرنی بھی منظور ہے۔اور اپنی نسل کو اس راہ میں قربان کرنا بھی گوارہ ہے یہ خاموش اعلان اگر دل کی گہرائیوں سے ہو تو کتنا اثر انگیز اور کس قدر روح پرور ہے۔

سچ مچ اس سے کشت ایمان لہلہانے لگتی ہے۔نخل روحانیت بار بر ہو جاتی ہے۔اور انسان اپنے آپ کو خدا کی گود میں پاتا ہے۔از روئے قرآن۔قرآن مجید نے رمضان المبارک کے روزے فرض فرما کر مومنوں پر احسان فرمایا ہے۔اس نے ان کی خفتہ قوتوں کو بیدار کر دیا ہے۔اور انہیں عام حیوانی سطح سے اٹھا کر فضائے نور و روحانیت میں پہنچا دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ لیلۃ القدر کا تعلق رمضان مبارک سے ہے۔اور لیلۃ القدر وہ رات ہے جب قلب مومن خدا کا عرش بن رہا ہوتا ہے اور فرشتے اور جبرائیل اس کے گرد طواف کرتے ہیں۔اور وہ انسان خدا سے شرف ہم کلامی حاصل کرتا ہے ایسی گھڑی کا میسر آنا یقیناً زندگی بھر سے بہتر ہے۔اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:"لیلۃ القدر خیر من الف شھر تنزل الملٰٓئکۃ والروح فیھا باذن ربھم من کل امر" اسلام ایک زندہ مذہب ہے۔اور ہر رمضان المبارک اس کی زندگی کا موسم بہار ہے۔خوش قسمت ہیں وہ جو موسم بہار کے پھلوں اور پھولوں سے اپنے دامنوں کو بھر لیں اور سفر آخرت کے لئے بہتر زادراہ حاصل کر لیں۔رمضان المبارک چمن روحانیت کے لئے موسم بہار ہے۔اس سے دلوں میں نور اور نیّات و عزائم میں تازگی پیدا ہوتی ہے، مومن کی رگ رگ میں زندگی دوڑ جاتی ہے۔مرجھائے ہوئے پودے ہرے ہو جاتے ہیں۔اور ٹنڈ منڈ درختوں میں پتے، شگوفے، پھول اور پھل نظر آتے ہیں۔خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

(سورۃ بقرہ آیت نمبر ۱۸۴۔۱۸۶) ترجمہ۔اے مومنو! تمہارے متقی بننے کے لئے ہم نے تم پر اسی طرح چند مقررہ ایام کے روزے فرض کئے ہیں۔جس طرح پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے۔ہاں تم میں سے جو بیمار یا مسافر ہو وہ دوسرے دنوں میں بیماری اور سفر کے دوران چھوڑے ہوئے روزوں کی تعداد پوری کرے۔جن لوگوں کو روزہ رکھنے کی بالکل طاقت نہ ہو۔(دائم المریض وغیرہ) وہ ایک مریض کا کھانا بطور فدیہ دے دیں۔جو شخص نیکی کو شوق سے اور بڑھ چڑھ کر کرے گا۔تو یہ اس کے لئے بہت بہتر ہوگا۔اگر تم سمجھو کہ روزہ رکھنا تمہارے لئے مفید اور بابرکت ہے۔

رمضان المبارک کے مہینے میں اس قرآن مجید کا نزول ہوا۔جو تمام جہانوں کے لئے احکام ہدایت پر مشتمل ہے۔اس میں ہدایت کے بیّنات بھی ہیں۔اور فیصلہ کن محکم دلائل بھی ہیں۔پس جو شخص اس مہینہ میں حاضر ہو، بیمار اور مسافر نہ ہو اُس پر اس کے روزے رکھنا فرض ہے۔ہاں تم میں سے جو بیمار یا مسافر ہو وہ دوسرے ایام میں تعداد پوری کرے۔اللہ تعالیٰ تمہارے لئے سہولت چاہتا ہے۔تنگی نہیں چاہتا۔تا تم مقررہ تعداد پوری کر سکو اور اس ہدایت پر جو تمہیں اللہ نے دی ہے اس کی بڑائی بیان کرتے رہو۔تا تم اس کے شکر گزار بندے قرار پاؤ"۔از روئے حدیث۔حضرت سلمان فارسیؓ بیان کرتے ہیں کہ شعبان کے آخری دن سرور کونین محمد ﷺ نے خطبہ میں فرمایا:"کل سے تم پر ایک عظیم القدر مہینہ چڑھ رہا ہے۔یہ بہت برکت والا مہینہ

ہے۔اس مہینہ میں ایک ایسی رات آتی ہے۔جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے اِس ماہ کے روزے فرض قرار دیئے ہیں۔اس کی راتوں میں تہجد کے لئے اُٹھنا بہت بڑی طوعی نیکی ہے۔

اس ماہ میں جو کوئی نفلی کام کرتا ہے۔اسے اتنا ثواب ملتا ہے جتنا دوسرے مہینوں میں فرض کے ادا کرنے سے ملتا ہے۔اور فرض کا ثواب تو اس ماہ میں ستر گنا زیادہ ہوجاتا ہے۔یہ صبر کا مہینہ ہے۔اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔پھر یہ باہمی ہمدردی کا بھی مہینہ ہے۔اس ماہ میں مومن کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے۔جو شخص اس مہینہ میں کسی روزے دار کا روزہ افطار کراتا ہے اسے گناہوں سے مغفرت حاصل ہوتی ہے۔اور اس کی گردن آگ سے آزاد کی جاتی ہے۔اور روزہ دار کے ثواب میں کسی قسم کی کمی کے بغیر روزہ افطار کرانے والے کو بھی ویسا ہی ثواب ملتا ہے"(مشکوٰۃ المصابیح صفحہ ۱۷۳ کتاب الصوم) اس خطبہ نبوی میں رمضان المبارک کی بہت سی برکات کا ذکر موجود ہے۔اور نبی ﷺ نے تمام مسلمانوں کو جن پر روزہ فرض ہے۔روزہ رکھنے کی تاکید فرمائی ہے۔رمضان المبارک دعاؤں کی خصوصی قبولیت کا مہینہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک کے ذکر میں ہی فرمایا ہے۔اُجیبُ دعوۃ الداعِ اِذا دعانِ۔کہ میں دعا کرنے والوں کی دعاوں کو خاص طور پر سنتا ہوں۔لیلۃ القدر رمضان المبارک کا خاص موقع ہے۔جبکہ انوار و برکات سماویہ کا خاص نزول ہوتا ہے اور دلوں پر رحمتوں کی غیر معمولی بارش ہوتی ہے۔رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف کی عبادت بھی ایک خاص عبادت ہے۔جبکہ مومن دس دن کے لئے خدا کے گھر میں دھونی رما کر بیٹھ جاتے ہیں اور روز و شب مسجد میں ہی عبادت اور ذکر میں بسر کرتے ہیں۔روزہ اپنی ذات میں ہی ایک پُر کیف روحانی عبادت ہے۔اس پر رمضان المبارک کے روزوں کی غیر معمولی برکات تو نورعلیٰ نور کی حیثیت رکھتی ہیں۔ہمیں چاہیئے کہ ان برکات سے حصہ کامل حاصل کریں۔

روزہ ڈھال ہے

عبداللہ بن مسلمہ، مالک، ابوالزناد، اعرج، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روزہ ڈھال ہے، اس لیے نہ تو بری بات کرے اور نہ جہالت کی بات کرے اگر کوئی شخص اس سے جھگڑا کرے یا گالی گلوچ کرے تو کہہ دے میں روزہ دار ہوں، دوبار کہہ دے۔قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے وہ کھانا پینا اور اپنی مرغوب چیزوں کو روزوں کی خاطر چھوڑ دیتا ہے اور میں اس کا بدلہ دیتا ہوں اور نیکی دس گنا ملتی ہے۔

صحیح بخاری: جلد اول: حدیث نمبر 1789

حضرت سلطان باہو اور محمد اقبال

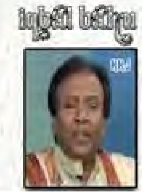

24 مارچ مشہور لوک فنکار اور حضرت سلطان باہو کا کلام گانے والے محمد اقبال باہو کا یومِ وفات ہے۔محمد اقبال جو لوک اور صوفیانہ کلام کی گائیکی کی دنیا میں اقبال باہو کے نام سے مشہور تھے، 1944ء میں گورداس پور میں پیدا ہوئے۔ان کے والدین نقلِ وطن کر کے پاکستان آ گئے اور محمد اقبال کی تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے ایک بینک میں ملازمت اختیار کر لی لیکن بینک انتظامیہ نے کبھی ان کی فنکارانہ مصروفیات میں مداخلت نہ کی اور محمد اقبال ریڈیو، سٹیج اور ٹیلی ویژن پر مسلسل اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔

ویسے تو انہوں نے لوک گیتوں اور صوفیانہ کلام میں مہارت حاصل کی تھی لیکن صوفی شاعر حضرت سلطان باہو کا کلام ان کے گلے کو ایسا راس آیا کہ انھیں محمد اقبال سے اقبال باہو کر دیا۔صوفیاء کا کلام گاتے ہوئے اقبال باہو زبان کی صحت اور کلاسیکی الفاظ کے تلفظ کا خاص خیال رکھتے تھے۔بابا فرید کے کلام کی تیاری کرتے ہوئے انہیں کئی بار ماہرینِ لسانیات سے رابطہ کرنا پڑا، تا کہ قدیم پنجابی کے الفاظ درست تلفظ میں ادا ہو سکیں۔اقبال باہو نے ہیر کی روائیتی گائیکی میں بھی کچھ جدتیں پیدا کیں اور اُن کی گائی ہوئی ہیر جلد ہی عوام و خواص میں مقبول ہوگئی۔محمد اقبال باہو نے اپنی گائیکی پر بے شمار اعزازات حاصل کئے، اور حکومتِ پاکستان نے انہیں 2008ء میں تمغہ امتیاز عطا کیا تھا۔محمد اقبال باہو 24 مارچ 2012ء کو دل کا دورہ پڑنے سے لاہور میں انتقال کر گئے اور لاہور ہی میں آسودہ خاک ہوئے۔

رمضان کے ایک روزہ کی اہمیت

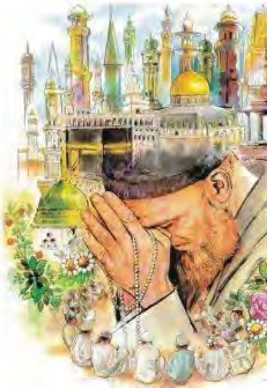

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!

"جو شخص رمضان کا ایک روزہ بھی بلا عذر شرعی (سفر اور مرض کے بغیر) چھوڑ دے، پھر مدت العمر اس کی تلافی کے لیے روزے رکھے، تب بھی ایک روزے کی کمی پوری نہ ہوگی۔(ترمذی، ابوداؤد)

میرے وطن کے دانشورو

رانا عبدالرزاق خان

کسی قوم کے دانشوروں کے کردار سے کسی بھی قوم کے معیار کا پتہ چلتا ہے۔ دانشور کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اُس میں بے داغ کردار نظر آئے۔ اُس میں سچائی، عدل وانصاف، رحمدلی، ہمدردیٔ مخلوق، اصول پسندی، نظر آئے۔ دانشور اور لیڈران کسی بھی قوم کا ایک تھنک ٹینک اور سرمایہ ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ریٹائرڈ سینئر افسران، ججز، بیوروکریٹس، جنرلز بھی قومی دانشور ہی ہوتے ہیں۔ جو اپنے تجربات کی روشنی میں کارِ حکمرانی میں نمایاں راہنمائی کر کے اپنا بھرپور کردار ادا کیا کرتے ہیں۔ ماضی کے مسلمان معاشرے میں تو ہر زمانے میں ہی ایسے باکردار لوگوں نے قوموں کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ ہماری تاریخ گواہ ہے اس طبقہ دانش وعقیل نے قوموں کی تعمیر میں غیر معمولی کردار ادا کیا تھا۔ مگر پاکستان کی حالیہ دانشوروں کی تاریخ کو اگر اب تنقیدی نظر سے کھنگالا جائے تو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ قائد اعظم اور ان کے چند ساتھیوں کے علاوہ آہستہ آہستہ ہماری قوم کا یہ طبقہ اپنے کردار کو مسخ کرتا گیا، حتیٰ کہ بدکردار اور طامع افراد کی حوصلہ شکنی سے اُن کے سوچ کے ساتھ مل گیا۔

اُقرباء پروری، لالچ، نفسا نفسی، قومی املاک کو شیرِ مادر سمجھ کر ہڑپنے لگا۔ ایمان باللہ اور خاکساری کی بجائے ظاہری ٹھاٹھ باٹھ کو ترجیح دے کر آخرت اور حساب یوم الآخر کو بھلا بیٹھا، جب عام شخص نے اپنے دانشوروں کو، علماء کو، شعراء، ادبا، ریٹائرڈ افسران کو، ججز اور بیوروکریٹس کو یہ طرزِ فکر اور طرزِ زندگی اپناتے ہوئے دیکھا تو علمائے سُو نے بھی اپنی دینی تشریحات کو شکم پُری کے مطابق بیان کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ اسلامی فرائض اور نوافل میں تاویل کر کے ساری قوم کو منفی راہ پر لگا دیا۔ دین کو دنیاوی مقاصد کے لئے استعمال شروع کر دیا۔ قوم کی تربیت کچھ اس طرح سے ہوئی کہ اب جائز کام بھی رشوت کے بغیر نہیں ہو پاتا، جس ملازم یا افسر کے پاس کار، بنگلہ، کوٹھی، بزنس، شوگر ملز، قبضہ پلاٹ، زرعی فارم، کاروبار، دس نوکر، ڈیرہ داری، لونڈے، لونڈیاں، دس کتے، پانچ گھوڑے، گائے اور بھینسیں، عشر وزکوۃ کی چیرمینی، ایم پی اے، ایم این اے شپ، ضلع ناظم، کونسلر، نہ ہو وہ امیر نہیں کہلا سکتا۔ اور جس سفید پوش کی تھانے اور پولیس تک رسائی نہ ہو اُسے بھی عزت کی نگاہ سے کوئی نہیں دیکھتا۔ اُقرباء پروری اور سفارش رشوت نے ساری مسلمان قوم کو اخلاق باختہ کر دیا ہے۔

پولیس میں، انتظامیہ میں، عدلیہ میں رشوت کو رزقِ حلال سمجھ لیا گیا ہے۔ مساجد تربیت میں ناکام اور مدرسے دہشت گردی کے کارخانے بن چکے ہیں۔ علمائے سُو نے اپنے فتاویٰ کے ذریعے لوگوں کو ورغلا کر دینِ حقیقی سے نابلد رکھا ہے۔ ہمارے دانشمند، ریٹائرڈ سینئر افسران، ججز، بیوروکریٹس، جنرلز وغیرہ اسی رو میں بہہ چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر سیاسی کارکن بن کر ساری قوم عیاری اور حرام خوری کے دھندے میں برابر کے شریک ہے۔ قومی املاک اور قومی دولت کو لوٹنے میں ہر شخص ہمہ تن مصروف ہے۔ آپ جس طرف بھی نظر دوڑا کر دیکھ لیں۔ آج تک جتنی بھی کرپشن ہوئی، پرچے ہوئے، کمشن بنے، مگر کوئی بھی بدانجام کو نہ پہنچ سکا۔ اگر صرف عدلیہ ہی عدل پر قائم رہتی تو یہ نوبت نہ پہنچتی۔ ہماری غلامانہ ذہنیت نے ہر حکمران کی غلامی کی، اور منہ نیچے کر کے کھاتے رہے۔ یحییٰ خان کا کسی نے محاسبہ نہ کیا، بھٹو اور اس کی اولاد کا احتساب خدا کے بغیر نہ کوئی کر سکا، ضیاع الحق کو کسی نے نہ پوچھا صرف آگ اُس کا ٹھکانہ بنی، بے نظیر کو صرف خدا نے پوچھا، نواز شریف کتنے عرصے سے قوم کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے، مشرف مشرف بہ انعام ہوتے رہے، زرداری پانچ سال قوم کو لوٹتا رہا، الطاف حسین کو ڈالروں سے بدہضمی ہو چکی ہے۔ اب پھر جاتی عمرے کے لوہار کا پتہ چلا ہے کہ ہوسِ زر سے قارون بن چکا ہے۔ پانامہ لیکس شور مچا رہا ہے۔ کئی ممالک کے باغیرت غیر مسلم وزرائے اعظم اور وزیر مستعفیٰ ہو چکے ہیں اور یہ مستقبل کا بے ریش امیر المومنین، کعبے کا مہمان، نام نہاد شریف، بضد ہے کہ ساری قوم جھوٹ بول رہی ہے اور یہ دودھ کا نہایا ہوا ہے۔

آخر ظالم کی باری آ ہی جاتی ہے۔ اور لوہار کے درباری، خواجے، رانے، پرویز رشید بھی شور و غوغا مچا کر حق نمک ادا کر رہے ہیں۔ شور مچائے شور، اس قوم میں نہ کوئی دانشور ہے، نہ کوئی عالم بہ عمل ہے، اگر کوئی ہوتا تو کلمہ گو لوگوں کو کافر کیوں گردانتے، اور ان کو قتل کیوں کرتے، ممتاز قادری کو غازی کیوں کہتے، جج بھی سب راشی، جنرل بھی سب راشی، جتنا بڑا افسر اتنا بڑا کرپٹ ڈاکو ہے۔ کیونکہ لٹیروں نے سب بھونکنے والوں کو ہڈی ڈال رکھی ہے۔ یہ ملک مسلمانوں کے لئے بنا ہے، اس میں سے سب غیر مسلموں کو نکالنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ سرکاری مسلمانوں کو اصل اسلام کے اصولوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ اس لئے اُن پر اکثریتی کے زور پر توہین رسالت کے مقدمے بنائے جاتے ہیں مگر سرکاری مسلمان تو ہر دو نمبری، سور خوری، حرام خوری، زناکاری شراب خوری، میں سب دنیا کے کافروں اور غیر مسلموں پر بازی لے گئے ہیں۔ قانون صرف کمزور کے لئے ہے۔ امتناع قادیانیت آرڈیننس کی بجائے امتناع ذخیرہ دولت آرڈیننس، امتناع رشوت ستانی آرڈیننس، امتناع بددیانتی آرڈیننس، امتناع الیکشن دھاندلی آرڈیننس، امتناع کمیشن خوری آرڈیننس، امتناع ملاوٹ کردن

آرڈیننس، امتناع جعلی ڈگری آرڈیننس، امتناع سگ راشہید گفتن آرڈیننس، جاری کردیتے، تو شاید یہ قوم کی تصویر کچھ اچھی بن جاتی۔ مگر ہماری ساری قوم مع دانشورو اشرافیہ مردہ ہو چکی ہے نفسا نفسی کا عالم ہے۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی، اسلام زندہ باد۔

گلوکار شرافت علی- قیصرہ خان

4اپریل گلوکار شرافت علی کا یومِ وفات ہے۔ جو اپنے سپرہٹ گانے ''جب تیرے شہر سے گزرتا ہوں، تیری رسوائیوں سے ڈرتا ہوں'' کیلئے مشہور ہے۔ شرافت علی پیشہ ور گلوکار نہیں تھے بلکہ وہ علیگڑھ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ آرٹسٹ تھے جو وہاں سٹیج ڈرامے کیا کرتے تھے۔ شرافت علی نے 1958ء میں بننے والی پاکستانی فلم 'وعدہ' کیلئے رشید عطرے کی موسیقی میں دو نغمات گائے جن میں ایک ''جب تیرے شہر سے گزرتا ہوں، تیری رسوائیوں سے ڈرتا ہو' اور دوسرا گلوکارہ کوثر پروین کے ساتھ''بار بار برسیں مورے نین'' شامل ہیں۔ شرافت علی 4اپریل 1991ء کو کراچی میں انتقال کرگئے۔

جناب سرور بارہ بنکوی- علینا خان

3اپریل اردو کے ممتاز شاعر، فلم ساز اور ہدایت کار جناب سرور بارہ بنکوی کا یومِ وفات ہے۔ سرور بارہ بنکوی کا اصل نام سعید الرحمن تھا۔ وہ 30جنوری 1919ء کو بارہ بنکی (یو پی، متحدہ ہندوستان) میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے پہلے کراچی اور پھر ڈھاکا میں سکونت اختیار کی۔ ڈھاکا میں انہوں نے فلم تنہاء کے مکالمے لکھ کر اپنے فلمی سفر کا آغاز کیا اور پھر چندا، تلاش، ناچ گھر، کاجل، بہانہ، ملن، نواب سراج الدولہ، تم میرے ہو، آخری اسٹیشن، چاند اور چاندنی، احساس، سوئے ندیا جاگے پانی اور کئی دیگر فلموں کے نغمات لکھے جو بہت مقبول ہوئے۔ اسی دوران انہوں نے تین فلمیں آخری اسٹیشن، تم میرے ہو اور آشنا پروڈیوس اور ڈائریکٹ بھی کیں۔ سرور بارہ بنکوی کے دو شعری مجموعے ''سنگ آفتاب اور سوز گیت'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ آخری دنوں میں وہ بنگلہ دیش کے اشتراک سے ایک فلم ''کیمپ 333'' بنانا چاہتے تھے۔ وہ اسی سلسلے میں ڈھاکہ گئے ہوئے تھے کہ دل کا دورہ پڑنے کے باعث 3اپریل 1980ء کو ڈھاکا میں ہی وفات پا گئے۔ ان کا جسد خاکی کراچی لایا گیا جہاں وہ سوسائٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔

سلیم حسین۔ علیشاہ خان

2اپریل پاکستان کے موسیقار بھائیوں کی مشہور جوڑی سلیم اقبال میں چھوٹے بھائی سلیم حسین کا یومِ وفات ہے۔ سلیم حسین 1933ء میں لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے بڑے بھائی اقبال حسین کے کلاسیکی موسیقی کے استاد خان صاحب سردار خان سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں انہوں نے فیروز نظامی کے اسسٹنٹ کے طور پر دوپٹہ اور چن وے کی موسیقی میں ہاتھ بٹایا۔ ان فلموں کی کامیابی کے بعد سلیم اقبال نے اپنے طور پر موسیقی دینے کا فیصلہ کیا۔ بطور موسیقاران کی پہلی فلم شیخ چلی تھی جس کے نغمات سے، خاص طور پر 'سیوں نی میرا دل دھڑ کے' سے وہ راتوں رات پورے ملک میں مشہور ہوگئے۔ ان کی دیگر فلموں میں 'گھر جوائی' کرتار سنگھ، جادوگر، دروازہ، باجی، مہندی والے ہتھ، اک پردیسی ایک مٹیار، پھنے خان، مادر وطن، لٹ دا مال، میرا ویر، یار دوست، پاکیزہ، پیا ملن کی آس اور دکھ سجناں دے شامل ہیں۔ سلیم اقبال کی کمپوزیشن میں مشہور ہونے والا سب سے مقبول نغمہ فلم' کرتار سنگھ' کا گیت ''دیساں دا راجہ میرے بابل دا پیارا'' ہے جو آج بھی ان کی پہچان سمجھا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ بہت ہی مشہور ملّی ترانے 'اے راہِ حق کے شہیدو' کی موسیقی بھی سلیم اقبال نے ترتیب دی تھی۔

سید قاسم محمود- سامعہ خان

31 مارچ اردو کے ممتاز افسانہ نگار، مترجم، صحافی اور متعدد حوالہ جاتی کتب کے مولف سید قاسم محمود کا یوم وفات ہے۔ سید قاسم محمود 17 نومبر 1928ء کو کھرکھودہ ضلع روہتک میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ 1951ء میں مجلس زبان دفتری، حکومت پنجاب سے بطور مترجم منسلک ہوئے۔ بعدازاں وہ لیل ونہار، صحیفہ، کتاب، سیارہ ڈائجسٹ، ادب لطیف اور قافلہ کے مدیر رہے۔ 1970ء میں انہوں نے لاہور سے انسائیکلو پیڈیا معلومات کا اجرا کیا۔ 1975ء میں انہوں نے مکتبہ شاہکار کے زیر اہتمام شاہکار جریدی کتب شائع کرنا شروع کیں۔ 1980ء سے 1998ء تک وہ کراچی میں مقیم رہے جہاں انہوں نے ماہنامہ افسانہ ڈائجسٹ، طالب علم اور سائنس میگزین کے نام سے مختلف جرائد جاری کئے اور اسلامی انسائیکلو پیڈیا، انسائیکلو پیڈیا فلکیات، انسائیکلو پیڈیا ایجادات اور انسائیکلو پیڈیا پاکستانی کا شائع کئے۔ ان کے اسی نوع کے متعدد کام ان کی وفات کی وجہ سے ادھورے رہ گئے۔ وہ ایک اچھے افسانہ نگار اور مترجم بھی تھے اور ان کے افسانوں کے مجموعے دیوار پتھر کی، قاسم کی مہندی اور وصیت نامہ کے نام سے اشاعت پذیر ہوئے تھے۔ 31 مارچ 2010ء کو سید قاسم محمود لاہور میں وفات پا گئے اور جوہر ٹاؤن کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔

روزہ دار کی دعا اللہ رد نہیں کرتے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!

تین آدمیوں کی دعا رد نہیں کی جاتی: عادل حکمران، روزہ دار حتی کہ روزہ افطار کرلے، اور مظلوم-

(ترمزی #۳۵۹۸ حدیث حسن)

ہمارے صاحبانِ تعلیم وتربیت

راناعبدالرزاق خان۔لندن

ہمارے ملک پاک میں جہالت اور کم علمی کی بنا پر قوم لبرل نہ بن سکی۔تعلیم کو فروغ دینے میں ہر دور میں جاگیردارانہ سوچ کی وجہ سے تعلیمی پستی بڑھی۔محکمہ تعلیم کی کم وسائل ہونے کی پوزیشن سے دینی مدرسوں نے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔لوگوں نے مفت تعلیم اور ثواب کی خاطر اپنے بچوں کو مدرسوں کی نذر کر دیا۔جہاں قرآن پڑھنے کے علاوہ اور کوئی دنیاوی تعلیمی نصاب بھی نہیں ہوتا،فقہی مسائل کو فرقہ واریت کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔مدرسے کے انچارج زیادہ تر پکی روٹی پڑھے ہوئے نیم ملاں ہوتے ہیں جن کا خود کا علم واجبی سا ہوتا ہے۔دینی علم،عربی کا قائدہ اور قرآن وہ پڑھاتے ہیں اور نمازوں کی باقاعدگی کی طرف گامزن رہتے ہیں مگر انہیں بچوں کی نفسیات،ان کی صحت اور مستقبل کی فکر،دنیاوی علوم کی فکر نہیں ہوتی۔خود بھی وہ شکم پُری کے چکر میں رہتے ہیں۔علاقے کے جاگیردار،نمبردار،صوبائی اور قومی اسمبلی کے ممبران کے وہ پابند ہوتے ہیں۔بعض بااثر افراد جو مدرسہ کی انتظامیہ سے منسلک ہوتے ہیں۔وہی اس مولوی کے اور مدرسہ کے مدارالمہام ثابت ہوتے ہیں۔جوں ہی بچے مدرسہ سے فارغ ہوتے ہیں تو جو بچے علم دین سیکھنے کی خواہش کرتے ہیں ان کو علاقائی بڑے مدرسوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔باقی جن کی دلچسپی دنیا کی طرف ہوتی ہے وہ نیم ملاں بن کر زندگی کے دھارے میں اپنے طور پر شامل ہو جاتے ہیں۔ضیاء الحق کے دور میں مجاہدین کی ضرورت کے پیش نظر مدرسوں کی تعداد ہزاروں میں بڑھی اور اس طرح طلباء کی تعدا میں بیرونی امداد سے خاطر خواہ اضافہ دیکھنے میں آیا۔یہاں دین کم اور دنیا زیادہ،دینی مسائل کم اور فرقہ ورانہ مسائل زیادہ سکھائے گئے۔لہذا آئندہ خونخوار قسم کے نیم ملاں پیدا کئے گئے۔جو آسانی سے کسی انسان کو بھی ذبح کر سکتے تھے۔

مکتبِ فکر نے متشدد انسان پیدا کئے ۔ اور اس طرح فرقہ واریت کو حوصلہ ملا۔ڈیڑھ اینٹ کی بے شمار مساجد زیادہ تیار ہوئیں ۔اور فساد فی الارض شروع ہوا۔علاقہ غیر اور سرحدی علاقے کے لوگوں نے اس روزگار کو غنیمت جان کر خوب اپنایا۔جوں ہی جہادِ افغانستان بند ہوا۔روس واپس ہوا تو ان افراد نے اسلحہ بنانا اور فروخت کرنا شروع کر دیا۔اس طرح ہمارے مولوی کی تربیت ہوئی۔اب یہ ہے تو مولانا،جس کے پاس علم کے بغیر اسلحہ بھی ہے،پارٹی بھی ہے،کوئی نہ کوئی روزگار بھی ہے ،پھر جب القائدہ کا دور آیا تو یہ بیروزگار لوگ اس سے منسلک ہو گئے۔ایجنسیوں نے ان سب کو استعمال کیا۔اور اس طرح طالبان کی نفری بھی بڑھ گئی۔قرآنی علوم کا ان نیم ملاؤں کو پتہ نہیں۔حقوق اللہ اور حقوق العباد سے یہ کلی نابلد ہیں۔ترجمہ نماز یا قرآن کا ان کو کچھ پتہ نہیں۔جو اُن کا پیرومرشد یا روزی نوکری دینے والا کہتا ہے۔وہی کام یہ کرتے ہیں۔ان کا مولانا سمیع الحق،منور حسن،مولانا عبدالعزیز کہتا ہے کہ فوجی شہید نہیں بلکہ طالبان کو شہید کہو،داعش اس کی راہنما ہے،حکومت اللہ کی ہے۔ہم کسی حکومت کو نہیں مانتے۔خود ساختہ خلافت پر یقین محکم رکھتے ہیں۔عورت کو تعلیم دینا حرام ،بلکہ اسے گھر سے باہر بھیجنا بھی خلافِ شرع خیال کرتے ہیں،متشدد اسلام کا تصور پیش کرتے ہیں۔خود کو بہترین اور اعلیٰ عالم خیال کرتے ہیں۔کئی کلمہ گو فرقوں کو علی الاعلان کافر گردانتے ہیں۔۔غیر مسلم کو واجب القتل خیال کرتے ہیں ۔بلکہ مرتد کہتے ہیں ۔تنگ نظر اور متشددانہ خیالات کے حامی ہیں۔قوم کو تنظیم،اخوت،ایمان کا درس و تعلیم دینے میں یہ علمائے سُو یکسر ناکام رہے۔قوم کی پاک تعلیم وتربیت،کردار کی تعمیر،شاہین اور خالد و طارق پیدا کرنے یا بنانے کے لئے حضرت ابوبکرؓ۔عمرؓ۔عثمانؓ۔علیؓ جیسے مخلص کرداروں کی ضرورت ہے۔آج کے یہ سیاسی علمائے سُو،جن کے کردار اور عمل اور سوچ سے گھن آتی ہے۔یہ اس دورِ بدتمیزی میں ایک پرخلوص اور مومن قوم کیسے پیدا کر سکتے ہیں۔جن کی آنکھیں چاندی کی چمک سے فوراً چندھیا جاتی ہیں۔جن کو قتل مسلم پر،تکفیرِ مومن پر ہر دم ناز ہے۔اناللہ و اناالیہ راجعون۔

سراج الدین ظفر۔اعزازلطیف خان

25 مارچ اردو کے نامور شاعر سراج الدین ظفر کا یوم ِ ولادت ہے۔سراج الدین ظفر 25 مارچ 1912ء کو جہلم میں پیدا ہوئے تھے۔ان کی والدہ بیگم زینب عبدالقادر خود بھی اردو کی ایک مشہور مصنفہ تھیں اور ان کے نانا فقیر محمد جہلمی سراج الاخبار کے مدیر اور حدائق الحنفیہ جیسی بلند پایہ کتاب کے مصنف تھے۔سراج الدین ظفر نے افسانے بھی لکھے اور شاعری بھی کی۔وہ لب و لہجے کے حوالے سے بے حد منفرد شاعر تھے۔’’شباب اور شراب‘‘ ان کا خاص موضوع تھا۔نئی نئی زمینیں تلاش کرنا اور ادر قافیوں میں رواں دواں شاعری کرنا انہی کا اسلوب تھا۔ان کی شاعری کے دو مجموعے (زمزمہ حیات اور غزال وغزل) کے نام سے شائع ہوئے تھے۔غزال وغزل پر انہیں 1968ء میں آدم جی ادبی انعام بھی ملا تھا۔6 مئی 1972ء کو سراج الدین ظفر کراچی میں انتقال کر گئے اور گورا قبرستان کے عقب میں فوجی قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ان کی لوح مزار پر انہی کا یہ شعر تحریر ہے۔ظفر سے دور نہیں ہے کہ یہ گدائے است...زمیں پہ سوئے تو اورنگ کہکشاں سے اٹھے۔

فاروق شیخ۔فرازحمید خان

25 مارچ بھارتی فلم،ٹی وی اور تھیٹر کے معروف اداکار،جناب فاروق شیخ کا یوم پیدائش ہے۔فاروق شیخ 25 مارچ 1948ء کو گجرات کے شہر بدولی کے قریب واقع ایک گاؤں نشوالی ضلع بڑودا میں پیدا ہوئے۔ان کا تعلق مالدار زمیندار خاندان سےتھا۔ان

کے والد مصطفٰی شیخ ممبئی میں وکالت کے پیشے سے منسلک تھے۔ فاروق نے سینٹ میری اسکول، ممبئی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد سینٹ زیویر کالج، ممبئی اور پھر قانون کی سند سدھارتھ کالج سے حاصل کی۔ وہ کچھ دن اپنے والد کے ساتھ وکالت کرتے رہے مگر وہ وکالت کے میدان میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ فاروق شیخ کو متوازی سنیما کے اہم اداکار کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے قانون کے پیشے میں ناکام رہنے کے بعد اداکاری اور تھیٹر کی جانب رجوع کیا۔ فاروق شیخ نے 1973ء میں فلم گرم ہوا سے اپنے فلمی سفر کا آغاز کیا جس کے بعد انہوں نے میرے ساتھ چل، شطرنج کے کھلاڑی، گمن، نوری، چشم بددور، ساتھ ساتھ، بازار، کسی سے نہ کہنا، رنگ برنگی، سلمٰی، فاصلے، کھیل محبت کا، گھر والی باہر والی، بیوی ہو تو ایسی، طوفان، مایا میم صاحب اور محبت جیسی فلموں میں اہم کردار ادا کرکے شہرت پائی۔ فلم امراؤ جان ادا بھی ان کے کیریئر کی ایک بہترین فلم تھی۔ حالیہ برسوں میں انہوں نے شنگھائی اور یہ جوانی ہے دیوانی نامی بھارتی فلموں میں بھی ایک عرصے کے بعد کام کیا۔ ان کی آخری فلم کلب 60 تھی۔ فلموں میں دیپتی نول کے ساتھ ان کی جوڑی کو بہت پذیرائی ملی۔ فاروق شیخ نے کئی آرٹ فلموں میں کام کے علاوہ تھیٹر اور ٹی وی پر بے شمار پروگراموں میں اداکاری کے ساتھ ساتھ ایک مشہور ٹی وی شو جینا اسی کا نام ہے کی میزبانی بھی کی۔ اس کے علاوہ ان کی دو ٹی وی سیریل چمتکار اور جی منتری جی نے بھی شہرت پائی۔ فاروق شیخ بہت شستہ اردو میں گفتگو کرتے تھے اور ان کا طرز تحریر بھی بہت خوبصورت تھا۔ کئی فلمی مکالمہ نگار اپنے مسودوں کی زبان و بیان کی سند فاروق شیخ سے لیا کرتے تھے۔ ان کا کلاسیکی اردو شاعری کا ذوق بہت اعلیٰ تھا۔ وہ اکثر ولی دکنی، غالب، میر، مومن، فیض، مخدوم محی الدین اور مجاز کے شعر گنگناتے تھے۔ فاروق شیخ اپنے اہل خانہ کے ساتھ نئے سال کی چھٹیاں منانے کے لیے دبئی گئے تھے جہاں 27 دسمبر 2013ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ انکی تدفین بھارت میں ہوئی۔

ایّام رمضان کے لئے
خاص دُعائیں
بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ
پہلا عشرہ رحمت
رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ
اے میرے ربّ مجھے بخش دے، مجھ پر رحم فرما، تو سب سے بہتر رحم فرمانے والا ہے
دُوسرا عشرہ مغفرت
اَسْتَغْفِرُ اللہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَیْہِ،
میں اللہ سے تمام گناہوں کی بخشش مانگتا / مانگتی ہوں جو میرا رب ہے اور اُسی کی طرف رجوع کرتا / کرتی ہوں
تیسرا عشرہ نجات
اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنَّا،
اے اللہ بے شک تو معاف کرنے والا ہے معاف کرنے کو پسند کرتا ہے پس ہمیں معاف فرمادے
اس کے ساتھ کثرت سے
لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کا ذِکر کریں ــــ یہ افضل الذکر ہے
اَلْحَمْدُ لِلّٰہ ــــ یہ افضل الدعا ہے

کُتّا - انشائیہ - امجد مرزا امجد

کُتا ہمارے ملک کیا دنیا کے ہر ملک میں پایا جاتا ہے لوگ اسے گھر میں بہت سے مقاصد کے لئے رکھتے ہیں۔ یہ واحد جانور ہے جو پلید اور حرام ہونے کے ساتھ گھروں میں دوسرے ممبران کی طرح رہتا ہے کتابوں میں ہے کہ اس کا ایک جدِ امجد اصحاب کہف کا وہ کتا جو کئی ہزار سال سویا رہا واحد کتا ہوگا جو جنت میں جائے گا۔ اپنے ہاں گھر کا دروازہ کھولیں تو ایک آدھ کتا گلی میں پھرتا ضرور نظر آتا ہے، اگر وہاں نہ نظر آئے تو کسی ہوٹل کے باہر اور قصائی کی دوکان کے باہر لازمی ہوگا۔ اب تو ہمارے ہاں بھی کتا رکھنے کا فیشن ہے اور اسے امیری کی نشانی سمجھی جاتی ہے یعنی اپنی بھوکی قوم کو یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ ہمارے پاس اتنی فالتو روٹیاں اور گوشت بچ جاتا ہے جو کتے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ مگر ایک بھرم ابھی ہمارے ہاں قائم ہے کہ کتوں کو اپنے ساتھ کرسی پہ بٹھا کر نہیں کھلاتے۔ اب اس کی کوئی بھی وجہ ہوسکتی ہے کہ ان کو اپنے کتے پہ بھی بھروسہ نہیں کہ کرسی پر بیٹھ کر ہماری کرسی ہی نہ چھین لے یا وہ ابھی اسے اس قابل نہیں سمجھتے کہ یہ ہمارے مقابل بیٹھے، جبکہ یورپ میں کتے اپنے مالکوں کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں اور کھانے کے بعد اپنی زبان سے ان کے ہاتھ منہ چاٹ کر اپنی محبت جتانے کے علاوہ انہیں باتھ روم جانے کی تکلیف سے بھی بچاتے ہیں۔ اس کے بدلے میں انگریز کتوں کے بھی بہت وفادار ہیں مرنے کے بعد اکثر لوگ اپنی ساری جائیداد ان چوپاؤں کے نام کردیتے ہیں کہ انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کونسی ایک سال ہی میں بیچ کر کھا دینی ہے، جبکہ اولاد سے یہ توقع زیادہ ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں انپڑھ آدمی بھی کتے کا نام انگریزی میں رکھتا ہے، اور اس سے باتیں بھی انگریزی میں ہی کرتا ہے۔ کتا واحد جانور ہے جو مساوات کا قائل ہے، اس کی نظر میں رنڈی کا کوٹھا ہو یا مسجد کی دیوار وہ بلاتمیز اس کے ساتھ اپنی ٹانگ اونچی کردیتا ہے۔ کتے کے اگلے دو دانت بہت تیز ہوتے ہیں خیر اتنے تیز تو نہیں کہ اس سے پنسل تراشی جاسکے مگر کاٹتے وقت یہی دانت اپنا کام دکھاتے ہیں اور زخمی کو چودہ ٹیکوں کا کورس کرانا پڑتا ہے، میرے ایک دوست اسی طرح ایک کتے کے دانتوں تلے آ گئے تو ہم جب اسے دیکھنے ہسپتال گئے تو سات ٹیکے لگوا کر کتوں کی تمام نسلوں کو اپنی بدعاؤں سے واصلِ جہنم کرچکے تھے۔ ہم نے کہا بھئی جب تم نے کتے کے تیور بھانپ لئے تھے تو پھر بھاگے کیوں نہیں۔ تو منہ بنا کر بولے ''واہ! یہ بھی خوب رہی پھر مجھ میں اور اس کتے میں کیا فرق رہ جاتا'' اس روز کے بعد ہماری نظروں میں اپنے اس دوست کی عزت بڑھ گئی لوگ اصول کے لئے جان دے دیتے ہیں یہ چودہ ٹیکے اور چار دانت کیا معنی رکھتے ہیں۔ کتے کی پونچھ ہمیشہ ٹیڑھی رہتی ہے۔ چاہے امریکہ صحیح فیصلے کرنے لگ

پڑے صدام حسین سے دوستی کر لے ۔واجپائی شادی کر لے یا چاہے ہمارے سیاستدان وطن پرست ہو جائیں اور اپنے سارے غیر ملکی بینک اکاؤنٹ اپنے ملک میں ٹرانسفر کرالیں...کتے کی دم پھر بھی کبھی سیدھی نہ ہوگی۔کتا اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے بس جنگل میں جا کر مار کھا جاتا ہے وہ بھی اپنی ٹیڑھی دم کی وجہ سے۔کتا خود اتنا خطرناک نہیں ہوتا جتنا اس کا نام خطرناک ہوتا ہے آپ گلی بازار میں جاتے ہوئے کسی کو یہ کہہ کے دیکھیں۔۔!!ہمارے ہاں اچھی نسل کے کتے گھروں میں رکھے جاتے ہیں جب کہ عام نسل یا بغیر نسل کے کتے (جن کے باپ کا کوئی پتہ نہ ہو) گلیوں بازاروں میں چھٹی پرانی کھال میں آوارہ دیکھے جاتے ہیں۔کبھی کسی نالی میں تو کبھی کسی چھپڑ میں۔مگر یورپ میں یہ صورت حال مختلف ہے۔کتے تو کتے رہے یہاں انسانوں کے باپ کا بھی پتہ نہ ہو تو انہیں کسی خاص نام سے نہیں بلایا جاتا وہ معاشرے میں اسی طرح عزت سے جیتے ہیں جیسا کہ باپ والے!! بلکہ اب تو حکومت کے کسی محکمہ کے کسی فارم میں بھی باپ کے نام والا خانہ ہی ختم کر دیا گیا ہے تا کہ کسی کو کوئی شرمندگی نہ ہو...ہمارے ہاں میونسپل کمیٹی کو کبھی کبھی یہ خیال آ جاتا ہے،وہ بھی تین چار سالوں کے بعد کہ شہر میں کتے زیادہ ہو گئے ہیں،تو وہ کتا پکڑ مہم چلاتی ہے (کتا مار نہیں!) اور ان دنوں گوشت کے بھاؤ میں کافی کمی آ جاتی ہے۔اور وافر تعداد میں نظر آتا ہے...رات کو شہر کے سب کتے مل کر میٹنگ کرتے ہیں اور شہر کی تمام گلیوں میں بھونکتے پھرتے ہیں جس سے ہماری پولیس اور چوکیداروں کو کافی تعاون ملتا ہے وہ آرام سے سوتے ہیں اور شہر کے کتے لوگوں کو جگائے رکھتے ہیں۔چوروں سے بچائے رکھتے ہیں۔انگلینڈ میں بوڑھی عورتوں نے چھوٹے چھوٹے کتے اٹھائے ہوتے ہیں جنہیں سردیوں میں سویٹر اور جرابیں تک پہنائی ہوتی ہیں اور بسوں میں بیٹھی انہیں کھڑکی کے باہر کی ہر بات سمجھا رہی ہوتی ہیں۔تنہائی کے یہ ساتھی انگریز کے بڑھاپے میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔کہتے ہیں کہ انسان بھی ایک سوشل جانور ہے تو وہ اپنے تعلقات کسی جانور کے ساتھ بھی رکھ سکتا ہے خاص کر کے جب اسے اپنی نسل کے جانوروں نے اکیلا کر دیا ہو تب یہ بھولا بھالا جانور اس کا ساتھ دیتا ہے اور خاموش ہو کے بڑے انہماک سے اس کی باتیں سنتا رہتا ہے۔کیونکہ بڑھاپے میں باتیں سنی اچھی نہیں لگتیں...سنانی اچھی لگتی ہیں...اور وہ کوئی بے زبان ہی سن سکتا ہے...میرا ایک ہندو دوست اکثر کہتا ہے کہ میں اپنے بھگوان سے پراتھنا کرتا ہوں کہ اگر میرے اعمال کی وجہ سے مجھے جانور بنایا گیا تو پھر وہ مجھے اگلے جنم کسی گوری کا کتا بنائے...جو مجھے ڈبوں میں بند مرغ اور قیمہ بسکٹوں کے ساتھ کھلائے،سارا دن مجھے گود میں اٹھائے پھرے اور رات کو مجھے سینے سے لگائے ساتھ سلائے...ظاہر ہے اگر اپنے کرموں کی وجہ سے اگلے جنم میں کتا ہی بننا ہے تو پھر انگلینڈ کی کسی گوری کا کتا کیوں نہ بنا جائے۔جو کسی کالے رنگ کے آدمی سے زیادہ کتے کو توجہ اور محبت دے گی...!

’’ترقی یافتہ‘‘ ممالک میں والدین کے ہاتھوں بچوں کی تلخیِ ایام

(ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔آسٹریلیا)

حال ہی میں آسٹریلیا میں ہونے والے ایک دردناک واقعہ کے بعد تشویشناک اعداد و شمار منظر عام پر آئے ہیں جن کے مطابق ہر سال آسٹریلیا میں پچیس (25) بچے اپنے والدین کے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں۔جبکہ امریکہ میں ہر سال اٹھارہ سال سے کم عمر کے 450 بچے اپنے والدین کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں۔

USA Today-4/16/2016 میں اسی طرح آسٹریلین انسٹی ٹیوٹ آف فیملی سٹڈیز اور ہیلتھ اینڈ ویلفیئر ادارہ کی رپورٹوں کے مطابق صرف سال 2013-14 میں 198966 بچوں کے متعلق شکایات موصول ہوئیں کہ ان کے والدین ان کی حق تلفی کر رہے ہیں اور ان سے غیر انسانی سلوک روا رکھتے ہیں۔گزشتہ چند سالوں سے جون 2014 تک حکومتی اداروں کو مداخلت کرکے 43900 بچوں کو ان کے والدین سے ’’بازیاب‘‘ کروایا گیا اور انہیں محفوظ تحویل میں رہائش دلوائی گئی۔ایسے بچے گو وقتی طور پر محفوظ ماحول اور سرکاری سرپرستی میں پرورش پاتے ہیں مگر بہرحال ان کے ذہنوں پر والدین کی بدسلوکی اور پھر والدین سے جدائی بھی انتہائی برا اثر ڈالتی ہے اور عموماً ان کی شخصیت ہمیشہ کے لئے زخم خوردہ اور ادھوری رہ جاتی ہے۔محرومی کا یہ احساس آگے چل کر ذہنی امراض اور باغیانہ پن کو بھی جنم دے سکتا ہے جس کا خمیازہ بسا اوقات پورے معاشرے کو بھگتنا پڑتا ہے۔

ان ممالک میں والدین کے اس تشویشناک رجحان میں اضافہ کی وجوہات نفسیاتی و دماغی امراض،ناکام ازدواجی زندگی،کثرتِ شراب نوشی و دیگر منشیات کا استعمال بتایا جاتا ہے لیکن مذہبی تعلیمات سے بے گانگی نیز بے نکاحی (De-Facto) ازدواجی زندگی بھی اہم وجوہات میں شامل ہیں۔

بچے خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک ہدیہ اور تحفہ ہوتے ہیں جن کے ذریعہ والدین کی آزمائش بھی مقصود ہوتی ہے اسی لئے قرآن مجید میں اولاد کو ایک قسم کا ’’فتنہ‘‘ یعنی آزمائش کہا گیا ہے۔ان کے حقوق کی ادائیگی کی تاکید کرتے ہوئے نبی پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم نے فرمایا:

اَکْرِمُوْا اَوْلَادَکُمْ وَاَحْسِنُوْا آدَابَھُمْ. فَاِنَّ اَوْلَادَکُمْ ھَدِیَّۃٌ اِلَیْکُمْ

یعنی اپنی اولاد کا اکرام کرو اور بطور احسن ان کے آدابِ (پرورش) بجا لاؤ،بیشک تمہاری اولاد تمہارے لئے ایک تحفہ ہے۔

(سنن ابن ماجہ)

نامور ڈرامہ نگار۔خواجہ معین الدین

وسیم باری

23 مارچ اردو کے نامور ڈرامہ نگار خواجہ معین الدین کا یوم ولادت ہے۔خواجہ معین الدین کا تعلق حیدرآباد (دکن) کے ایک زمیندار گھرانے سے تھا جہاں وہ 23 مارچ 1924ء کو پیدا ہوئے۔خواجہ معین الدین حیدرآباد (دکن) میں تھے تو اکثر ریڈیو دکن سے پروگرام نشر کرتے تھے۔اس کے علاوہ انہوں نے زمانہ طالب علمی میں چند ڈرامے بھی لکھے جن میں سے سرکاری دکان اور پرانے محل بہت پسند کیے گئے۔1948ء میں پاکستان آنے کے بعد بھی انہوں نے اس شغل کو جاری رکھا۔

پاکستان میں انہوں نے جو ڈرامے تحریر کیے ان میں سب سے پہلا ڈرامہ زوال حیدرآباد تھا۔اس کے بعد انہوں نے نیا نشان' لال قلعے سے لالوکھیت تک' تعلیم بالغان' مرزا غالب بندر روڈ پر' جیل کو کہیں سسرال' جلسہ عام اور ساون کا اندھا نامی ڈرامے نہ صرف تحریر کیے بلکہ ان کی ہدایات بھی دیں۔ان کے ڈرامے طنز کے نشتروں اور مزاح کی حلاوت کا ایک خوب صورت مرقع ہوئے تھے اور انہیں دیکھنے والے ایک لمحے کے لیے بھی ان کے مکالمات کے طلسم سے باہر نکل نہیں پاتے تھے۔خواجہ معین الدین نے صرف 47 سال کی عمر پائی۔9 نومبر 1971ء کو اردو کے نامور ڈرامہ نگار خواجہ معین الدین انتقال کر گئے۔مگر اتنی کم عمری کے باوجود وہ ڈرامہ نگاری میں اپنے انمٹ نقوش رقم کر گئے۔وہ کراچی میں سخی حسن کے قبرستان میں آسودہ خاک ہیں۔

۳۰۔اپریل کا کوٹلی آزاد کشمیر کا جلسہ پیپلز پارٹی

اے۔آر۔راجپوت

چور مچائے شور کا محاورہ تو سُنا تھا مگر بھیڑیا بھیڑیوں کا رکھوالا کبھی نہ سننے میں آیا تھا۔راجہ محمد اشرف سابق وزیراعظم پاکستان کی بے ہودہ تقریر سُن کر بہت ہی حیرت ہوئی۔جس نے درباری ہونے کا حق ادا کر دیا۔راجہ رینٹل تو تھا ہی مگر مینٹل بھی ہے۔لگا پیپلز پارٹی کی تعریفوں کا پُل باندھنے۔نہ اسے ڈھنگ کی بات کرنی آتی ہے اور نہ وہ آٹھویں گریڈ سے باہر نکل سکا ہے۔جس طرح سارے پیپلز پارٹی کے سیاسی اُجڈ بلاول کی چھتری کی تلاش میں ہیں۔جب ۱۹۸۸ء میں بے نظیر برسراقتدار آئی تھی تو کئی بگھیاڑوں کو اس نے پیچھے کر دیا تھا،اب بلاول آرہا ہے تو یہ سب پیپلز پارٹی کے سیاسی اُجڈ،ڈاکو،چور اُچکے،وطن کا خون پینے والے،طالبان کو اپنے بچے کہنے والے،خالصتان کو سکھ آزادی پسندوں کی فہرستیں دینے والے،سندھ کو چائینہ کٹنگ سے ہڑپ کرنے والے درباری نہیں رہیں گے۔اگر رہے تو پیپلز پارٹی نہیں رہے گی۔

راجہ محمد اشرف نے پرانے کارنامے گنوا کر نمبر تو بنانے کی سرتوڑ کوشش کی مگر خدا دیکھ رہا ہے۔ذرا بندہ ان سیاسی لُونچڑوں سے پوچھے کہ تمہیں سلیقہ حکمرانی کی ابجد کا بھی علم ہے۔مصلوب بھٹو اور بے نظیر کی لاش پر سیاست کرنے والو!تم تو دودھ پینے والے مجنوں ہو۔راجہ محمد اشرف نے اس جلسے میں ۹۰ سالہ مسئلے کا ذکر کر کے بھٹو صاحب کی احسان فراموشی کا اعادہ کیا ہے۔جس محسن جماعت نے سوفی صد سیٹیں جیت کر دیں،اور سارے ملک سے جتوایا،اُن محسنوں کے ساتھ بھٹو کا سلوک دیکھو اور پھر آج تک خدا کا سلوک دیکھو۔پیپلز پارٹی کی عزت دفن ہو چکی ہے اور وہ بھٹو کی محسن زندہ جماعت تو زندہ تر ہے۔میں کسی بھی جماعت کا نمائندہ تو نہیں ہوں مگر احسان فراموشی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔پھر ۴۲ سال سے یہ ۹۰ سالہ مسئلہ جو حل کیا تھا۔اب اس کے بعد ان ۴۲ سال میں ملک کی کیا حالت ہوئی۔۱۹۷۰ میں پاکستانی روپیہ برطانوی پونڈ کے برابر تھا۔اب کہاں ہے۔ملک کی عزت خاک میں ملا دی گئی۔اسلامی سربراہان کی کانفرنس میں جو سربراہان اس سازش میں ملوث تھے۔ان سب کے بدانجام کی تاریخ پڑھیں اور عبرت حاصل کریں۔شاہ فیصل،شیخ مجیب،کرنل قذافی،عدی امین،یاسر عرفات،شاہِ ایران وغیرہ وغیرہ کوئی بھی اپنے اپنے ملک کا خداوند بخیر انجام کو نہ پہنچا۔

جب سے اُس کلمہ گے افراد کو کلیدی اسامیوں سے نکال کر سرکاری مسلمان لگائے ہیں سارا نظام کرپٹ ہو گیا ہے۔بددیانتی کی اخیر ہو گئی ہے۔جج اسکینڈل تک ہرام خوری میں ملوث ہیں۔سوس اکاؤنٹس،سرے محل،پانامہ لیکس،عرب شیوخ کی پیروی میں دولت کے انبار لگانے کی خواہش قارون،فراعنہ،یہود و نصاریٰ کی تھی کہ مومنین کی اب رو پاکستان کے سرکاری مسلمان ۴۰۰ صد کے قریب پانامہ لیکس میں ملوث ہیں۔ہر ایک سرکاری مسلمان کا اکاؤنٹ پانامہ لیکس میں ہے۔ہم مرحوم بھٹو کو تو کچھ نہیں کہتے مگر یہ جو زبان دراز درباری کم علم جاہل،دُم ہلانے والوں کو اپنی اوقات کا تو علم ہونا چاہیئے۔یہ اُس فریق کا مقابلہ کرنے کے لئے تو تیار ہیں جو ان کے مدمقابل پر بھی آنا،اپنی بے عزتی سمجھے۔مگر پیپلز پارٹی والے اُس مدمقابل سے ڈرجاتے ہیں جس کا بے نظیر کو دیکھتے ہی خون کھولنے لگتا تھا۔جس نے آئی جے آئی بنا کر اس پیپلز پارٹی کا بستر گول کیا تھا۔پھر بے نظیر کو سیکیورٹی تھریٹ کہا تھا،اور جو پیپلز پارٹی کے بانی خواتین کے بے ہودہ ڈانس کی جعلی تصاویر کو منظر عام پر لائے تھے۔وہ گروہ بھول گیا جو کہتا تھا کہ عورت کی حکمرانی حرام ہے،ہائی کورٹ نے کہا تھا کہ بھٹو برائے نام مسلمان ہے،ان علمائے سُو کو بھول گئے جنہوں نے بذریعہ آرمی بھٹو کے ختنے چیک کروائے تھے۔پھر کوئی بھی ملک بھٹو کو پھانسی سے نہ بچا سکا۔تقدیر الٰہی چل کر رہی ہے۔اے پیپلز پارٹی کے بدکردار گماشتو!خدا سے ڈرو۔مشرف سے ڈر کر ڈر کر ملک سے بھاگنے والو!،پھر اسی سے ڈر کر میثاقِ جمہوریت کرنے والو۔پھر NRO کرنے والو،پھر مشرف کو گارڈ آف آنر دینے والو!تمہاری کوئی اوقات نہیں تم لوگ محب وطن نہیں صرف محب

شکم ہو۔ سارے ملک میں ایسے بھونکوں کا کوئی مقام نہیں، تم اب اپنی لوٹی ہوئی دولت کو بچانے کے چکر میں ہو، تم سب نیب کے پجاری ہو، کسی نہ کسی بت کے پیچھے چُھپ کر زندگی گزار رہے ہو۔ تم میں کوئی بھی معراج خالد نہیں، تم میں ایک بھی مبشر حسن نہیں، نہ تمہیں خدا کا خوف ہے اور نہ رسول کا، صرف خوف ہے تو NAB کا۔ تم سب مسٹر ٹین پرسنٹ کے درباری ہو۔ جب بھی کوئی اچھی خوراک دیتا ہے، دُم ہلانے لگ جاتے ہو۔ اپنی اوقات میں رہو، تم میں سے ہے کوئی جو صاحب کردار ہو تمہاری اولادیں تمہارے کردار کی پاکیزگی کی قسم دینے سے قاصر ہیں۔ پیپلز پارٹی میں اب کوئی بھی صاف وشفاف صاحب کردار نہیں، تم اُدھر ہم ادھر کا نعرہ لگانے والو! مجیب الرحمن کا مینڈیٹ نہ تسلیم کرنے والو!، کشمیر کا بیڑا غرق کرنے والو، تم نے شملہ معاہدے سے ہی کشمیر کا مسئلہ لٹکا دیا تھا۔ ۹۰ سالہ مسئلہ کھڑا بھی تم نے کیا تھا۔ اور بزعم خود یہ سب کچھ امن کے لئے کیا گیا تھا، بباطن سعودیہ اور باقی اسلامی ممالک سے بھیک لے کر یہ کام سرانجام دیا گیا تھا، آپ کے ساتھ جمعراتی ملاں بھی شریکِ کار تھے۔ اس کے بعد کیسا امن کا گہوارہ بنا آپ کا ملک ۔ جب سے ملاں کو سر پر چڑھایا ہے اب اُتار کر دکھاؤ۔ اپنی لیڈر مروانیکے بعد بھی تم خود اپنی جان بچاتے پھر رہے ہو ایک نہتی بے ضرر جماعت پر شیر بننے والو! ضیاع الحق کے آگے بھیگی بلی بن گئے تھے۔ تمہارے کھرجیسے لیڈر تو انڈیا بھاگ گئے تھے۔ منافقین، کرپٹ اور بدکردار لیڈر آپ کی پارٹی کا ناسور ہیں۔ پیپلز پارٹی پاپ کا نشان ہے اور اسی لئے اس میں بہت سارے جعلی ڈگری ہولڈرز، بے دین، مادر پدر آزاد، لٹیرے ہیں۔ ملکی اخبارات کو پڑھ کر دیکھیں تا کہ آپ کو آئینہ نظر آئے۔ مگر بنے پھرتے ہیں مفتی دین اسلام، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

تاریخی قرارداد – بلال افتخار

23 مارچ 1940ء وہ تاریخی دن ہے جب آل انڈیا مسلم لیگ نے لاہور کے مشہور منٹو پارک میں اپنے 27 ویں سالانہ اجلاس میں وہ تاریخی قرارداد پیش کی جو بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی۔ مسلم لیگ کے اس سالانہ اجلاس کی صدارت قائداعظم محمد علی جناح نے کی تھی اور یہ قرارداد شیر بنگال مولوی فضل حق نے پیش کی تھی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کے وہ علاقے جہاں مسلم اکثریت میں ہیں اور جو جغرافیائی طور پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں ان کی حد بندی اس طرح کی جائے کہ وہ خودمختار آزاد مسلم ریاستوں کی شکل اختیار کرلیں۔ اس قرارداد کی تائید چوہدری خلیق الزماں نے کی اور اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے پیش کیا۔
اس کی تائید میں خان اورنگ زیب خان، حاجی سرعبداللہ ہارون، نواب اسماعیل خان، قاضی محمد عیسیٰ، بیگم مولانا محمد علی جوہر، آئی آئی چندریگر، مولانا عبدالحامد بدایونی اور دوسرے مسلم اکابر نے تقاریر کیں۔ ابتدا میں اس قرارداد کو تقسیم ہند کی قرارداد یا قرارداد لاہور کہا گیا تھا مگر بیگم محمد علی جوہر نے اپنی تقریر میں اس کو پاکستان کی قرارداد کہا۔ ہندوستانی پریس نے طنز کے طور پر اس نام کو ایسا اُچھالا کہ لفظ پاکستان زبان زد خاص و عام ہو گیا۔ 7 برس کی جدوجہد کے بعد ہندوستان کے مسلمان اپنا وطن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کا نام پاکستان ہے۔ اب باوثوق حوالوں اور شخصیات اور برٹش لائبریری انڈیا آفس کے ریکارڈ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس قرارداد کا مسودہ چوہدری سرظفراللہ خان نے ریار کیا تھا جو کہ بعد میں پاکستان کے وزیر خاجہ بنے پھر اقوام متحدہ میں پاکستان کے نمائندے مقرر ہوئے۔ بعد ازاں انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے صدر بھی بنے۔

شیخ ایاز – محمد ابراہیم عابد

23 مارچ اردو اور سندھی کے نامور شاعر، دانشور، ماہر قانون اور ماہر تعلیم شیخ ایاز کا یومِ ولادت ہے۔ شیخ ایاز کا اصل نام شیخ مبارک علی تھا اور وہ 23 مارچ 1923ء کو شکارپور کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ گریجویشن اور قانون کی تعلیم کے حصول کے بعد انہوں نے 1950ء میں کراچی میں وکالت کا آغاز کیا۔ 1946ء میں ان کی مختصر کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''سفید وحشی'' شائع ہوا اس کے بعد ان کی کہانیوں کے کئی اور مجموعے شائع ہوئے جن میں پنھل کان پوءِ خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

اسی زمانے میں ان کی شاعری کی بھی دھوم ہوئی۔ ان کی روانی طبع اور برجستگی کو دیکھ کر کئی قادرالکلام اساتذہ بھی حیران رہ گئے۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''بھور بھرے آکاس'' 1962ء میں پاکستان رائٹرز گلڈ کے زیراہتمام شائع ہوا۔ اس مجموعہ پر 1964ء میں حکومت نے پابندی لگادی۔ ان کی شاعری کا دوسرا مجموعہ ''کلھے پاتم کینرو'' 1963ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ بھی 1968ء پابندی کی زد میں آ گیا۔ شیخ ایاز نے سندھی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی اپنا ذریعہ اظہار بنایا اور ان کی اردو شاعری کے مجموعے بوئے گل نالہ دل، کف گلفروش اور نیل کنٹھ اور نیم کے پتے کے نام سے شائع ہوئے۔ ان کی سندھی شاعری کا ایک اردو ترجمہ بھی ''حلقہ مری زنجیر کا'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ شیخ ایاز کا ایک بڑا کارنامہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مجموعہ کلام ''شاہ جو رسالو'' کا اردو ترجمہ ہے۔ شیخ ایاز کے اس ترجمے کی وساطت سے شاہ لطیف کا پیغام اُردو دان طبقے تک بھی پہنچا۔ شیخ ایاز کے کئی نثری کارنامے بھی اہل نظر سے داد حاصل کر چکے ہیں۔ جن میں ان کی تقاریر کا مجموعہ ''بقول ایاز''، خطوط کا مجموعہ ''جے کاک ککوریا کاپڑی''، مضامین کا مجموعہ ''بھگت سنگھ کھے فانسی'' اور یادداشتوں کے مجموعے ''کراچی جا ڈینھن ءِ راتیون'' اور ''ساہیوال جیل جی ڈائری'' خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ 1976ء میں انہیں سندھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ 28 دسمبر 1997ء کو شیخ ایاز کراچی میں وفات پا گئے۔ اور وہ بھٹ شاہ میں شاہ لطیف کے مزار کے احاطے میں آسودہ خاک ہیں۔

حقوق نسواں بل پر حکومت کا گھٹنے ٹیکنا

رجل خوشاب

پنجاب اسمبلی میں حقوق نسواں بل لاکر حکومت پھنس گئی ہے۔ جب سے علمائے کرام جماعت اسلامی اور جمیعت علمائے اسلام نے اس بل کی مخالفت کی ہے۔ حکومت سہم سی گئی ہے۔ کیونکہ کسی بھی مذہبی بل کو پاس کرنا علماء کے بغیر جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔حکومتیں تیس چالیس سال سے علمائے کرام نے اور مذہبی جماعتوں نے بلیک میل کررکھی ہیں۔ان مذہبی جماعتوں نے ۱۹۷۴ میں بھٹو کو بلیک میل کر کے احمدیوں کے خلاف قانون بنوایا تھا، پھر اپنے اثر ورُسوخ کو بذریعہ سعودی عرب ضیاء الحق کو بھی بلیک میل کیا۔اور جہادِ افغانستان کا ڈھونگ رچا کر مذہبی جماعتوں کا عمل دخل کارِ حکومت میں بڑھا۔ پھر بھٹو صاحب کو پھانسی دینے بھی ان مذہبی جماعتوں کی اشیر باد شامل تھی ۔ضیاء الحق کے دور میں شیعہ فرقے کو مذہبی جماعتوں نے ہی تہہ تیغ کروایا۔ ۱۹۸۴ میں ان ہی مذہبی جماعتوں نے جماعت احمدیہ کے خلاف قادیانیت آرڈیننس پاس کروایا۔ضیاع الحق کی موت کے بعد بے نظیر کے آنے کے بعد نواز شریف کو لانے کے لئے بھی انہی مذہبی جماعتوں نے بذریعہ ملٹری اسٹیبلشمنٹ (جنرل حمید گل) آئی جے آئی بنوا کر یہ کام سرانجام دیا۔اور اب تک مسلسل مقتدر حکومت کے ساتھ یہ مذہبی جماعتیں چمٹی رہی ہیں۔ حکومت نوازی مولانا فضل الرحمن کی تو یہ عادتِ ثانیہ بن چکی ہے۔طالبان اور القائدہ کے نمائندے بن کر یہ سب مذہبی جماعتیں مفادات کے مزے لیتی رہی ہیں۔حتیٰ کہ طالبان سے مذاکرات کے بھی یہی بھرپور حامی رہے ہیں۔

سارے صوبوں میں ان کے مدرسوں کا نیٹ ورک ہے۔ایک مدرسے کے طلباء بھی اگر یہ جماعتیں لاہور یا اسلام آباد کی سڑکوں پر لے آئے تو حکومت ڈر جاتی ہے ۔اصل میں تو اسلام کو کوئی خطرہ نہیں۔ مذہبی جماعتوں کے مفادات کو خطرہ ہے۔اب اسلامی نظریاتی کونسل کے گیارہ ممبر ریٹائرڈ ہورہے ہیں۔مولانا فضل الرحمن کا مطالبہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ممبران اس کی نامزدگی سے آئیں۔حالانکہ اسلامی نظریاتی کونسل ایڈوائز ہی کرسکتی ہے۔ جب تک فیڈرل شرعی کورٹ کوئی حکم پاس نہ کرے۔ بل میں کوئی مداخلت موثر نہیں ہوسکتی۔ یہ سارا کچھ مسلم لیگ ن کی ملاں نواز پالیسیوں کا کیا دھرا ہے۔پنجاب میں ان جماعتوں اور حکومت کے درمیان رانا ثناءاللہ پُل کا کام کررہا ہے۔جوں ہی مولانا فضل الرحمن نے جماعت اسلامی نے آنکھیں دکھائیں۔پنجاب اور وفاقی حکومت کی ہوا نکل گئی ہے۔ملاں کو غیرضروری طور پر سر پر چڑھا کر اب یہ لوگ پچھتا رہے ہیں۔ملاں کو ان مفادات سے انہی حکومتی چیلوں نے متعارف کروایا ہے۔کوئی اسلامی نظریاتی کا ممبر بنا چاہتا ہے،کوئی محکمہ اوقاف کے اثاثے کھانے پہ لگا ہے۔کسی کو سرکاری مساجد کا امام بنایا ہوا ہے،کسی کو ضلع میں عشر زکواۃ کا چیئرمین بنایا ہوا ہے۔کسی کو کچھ کسی کو کچھ عہدہ سونپ رکھا ہے۔

اصل بات ہے کہ اب ان علمائے سُو کے منہ کو خون لگ چکا ہے۔ جو حرام حلال کی تمیز کے بغیر فتاوئ دیتے ہیں اور عوام کو اسلام کی غلط تفسیر بتا کر سارے معاشرے کے امن و امان کو تباہ کرتے ہیں۔ کسی کو کافر کسی کو واجب اُقتل کسی کو سنگسار کرنے کے فتاوئ دیتے ہیں۔عوام کالانعام کسی مسیحی جوڑے کو بھٹہ خشت میں جلا کر راکھ کردیتے ہیں اور احمدیوں کو قتل کرتے ہیں۔ جوزف کالونی کو جلا ڈالتے ہیں ۔ گوجرے میں مسیحوں کو قتل اور پشاور میں چرچ میں دھماکہ کرکے ثواب دارین حاصل کرتے ہیں ۔ان علمائے سُو کی جذباتی تقاریر سُن کر ممتاز قادری گورنر سلمان تاثیر کو قتل کرتا ہے۔اور پھر یہ علمائے سُو اس کو جیل کے اندر جنت کی بشارت دیتے ہیں۔وہ پھر ایک قیدی کو جیل کے اندر ہی قتل کردیتا ہے۔ان علمائے سُو سے ڈر کر سب اقلیتیں پاک وطن چھوڑنے پر مجبور ہوچکی ہیں،سندھ کا ہندو انڈیا بھاگ رہا ہے۔کراچی کے یہودی اسرائیل جا چکے ہیں ۔ پاکستان میں زندہ رہنے کے لئے سب غیر مسلموں کو اپنے نام تک اور مذہب بھی چھپانا پڑتا ہے۔ پاکستان میں جتنا بھی کوئی بدکردار سرکاری مسلم ہو وہ غیر مسلم سے بہتر قرار پاتا ہے۔غیر مسلم کے خلاف نفرت انگیز تقاریر کا سلسلہ ابھی تک پنجاب میں بند نہیں ہوا۔علمائے سُو شتر بے مہار کی طرح اپنے ہدف کی طرف رواں دواں ہیں ۔حکومت کو پہلے ان سب کو لگام دینے کی ضرورت ہے۔قومی ایکشن پلان کی بجائے قوم آکشن پلان پر کام شروع ہے۔

ادباءوشعراء کے لطائف

ثقلین مبارک آسٹریلیا

۱۔مولوی نذیر احمد حیدرآباد دکن میں ڈپٹی کلکٹر تھے ۔انکا تبادلہ کسی اور شہر ہوگیا۔وہاں کے ایک رئیس ان کی ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔دورانِ گفتگو وہ اپنا شجرہ نسب نکال کر بتانے لگے کہ فلاں فلاں ہمارے رشتے کے دادا لگتے تھے۔فلاں ہمارے ماموں جان تھے وغیرہ وغیرہ۔مولوی نذیر احمد اس کی بے سود گفتگو سے تنگ آ کر کہنے لگے۔معاف کیجئے گا۔اس وقت میرا شجرہ نسب میرے پاس نہیں۔ورنہ میں بھی آپ کو بتاتا کہ ہمارا سلسلہ بھی بابا آدم سے ملتا ہے۔

۲۔فراق گورکھپوری آگرہ یونیورسٹی میں انٹر سائنس کے طالب علم تھے ۔تمام مضامین میں وہ اچھے نمبر حاصل کرتے مگر فزکس میں اکثر فیل ہوجاتے ۔ایک دن پرنسپل نے انہیں بلا کر پوچھا کہ بھئی باقی مضامین میں تم اچھے ہو مگر فزکس میں فیل کیوں ہوجاتے ہو۔فراق نے جواب دیا کہ جناب اس لئے کہ میں فزیکلی کمزور ہوں۔

۳۔پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار ایس پی سنگھا کے گیارہ بچوں کا آخری جز ’’سنگھا‘‘ تھا۔بارھواں لڑکا پیدا ہوا تو شوکت تھانوی سے مشورہ کیا کہ کیا نام رکھوں؟شوکت تھانوی نے بے ساختہ کہا،بارہ سنگھا رکھ دیجیئے۔

۴۔شاہ ایڈورڈ کی ولی عہدی کا زمانہ تھا۔انہوں نے اپنی والدہ ملکہ وکٹوریہ کو ایک خط لکھا جس میں اُن سے پانچ پونڈ مانگے تھے۔ملکہ نے رقم دینے کی بجائے ایک طویل خط لکھ دیا جس میں فضول خرچی اور کفایت شعاری پر لیکچر تھا۔ایک ہفتے بعد ولی عہد نے ماں کو شکریے کا خط لکھا۔جس میں تحریر تھا کہ اب مجھے پانچ پاؤنڈ کی ضرورت نہیں۔کیونکہ میں نے آپ کا خط بیس پونڈ میں بیچ کر اپنی ضرورت پوری کر لی ہے۔

ہائے یہ محب وطن پاکستانی - ابن لطیف

پاکستان جب سے بنا۔اسے بنانے والے تو اکثر قربانیاں دینے کے بعد مر چکے ہیں۔اور اُن کی اولادیں دربدر بھٹک رہی ہیں۔اس کے وجود میں آنے کے بعد ابن الوقتوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔نظریہ پاکستان کچھ اور تھا مگر اُسے بدل دیا گیا ہے۔یہ بے شک اسلام کے نام پر بنا تھا مگر اسے اسلام آباد کے لئے سمجھ لیا گیا ہے۔اسلام آباد سے مراد مادہ پرستی ہے۔یا نفس پرستی سمجھ لیجیئے۔ایمان،اُخوت اور تنظیم آپ کو کہیں بھی نہیں نظر نہ آئے گی۔جائزہ ۔اگر صدور سے شروع کر لیں با اختیار صدر ضیاع الحق کا نام ہی کافی ہے۔اس عہدے سے سڑاند آنے لگتی ہے،پھر مشرف اور زرداری کو سونگھ کر بتائیں کہ کہاں کی حب الوطنی ان غداروں میں تھی۔دہی بھلے والے صدر کے پاس تو کوئی اختیار ہی نہیں۔اب اس کے بعد وزرائے اعظم کا جائزہ لے لیں۔نواز شریف جو اس زمانے کا فرعون ہے۔اور شہباز شریف ہامان ثابت ہوا ہے۔پانامہ لیکس نے ان کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا ہے۔اگر عدلیہ سے شروع کریں تو ہمارے ججوں کا بیڑہ ہی غرق ہو چکا ہے۔افتخار چوہدری کا نام ہی کافی ہے۔جس کی آنکھ بھی ٹیڑھی تھی اور نیت بھی۔باقی ججوں کا جائزے کی ضرورت نہیں۔اگر عدلیہ ہی ٹھیک ہوتی تو میرا ملک جرائم کی پناہ گاہ نہ بنتا،اور ہر شہری قانون کا مذاق نہ اُڑاتا۔وکلاء نے تو کالے کوٹ کا مقام ہی کالے کرتوت کر دیا ہے۔جھوٹ کو فروغ ان کا پیشہ ٹھہرا۔اس کے بعد پارلیمنٹ ممبران کا کردار ہے کہ یہ لوگ کیا انسان ہیں۔کیا مسلمان ہیں۔کیا حب الوطن ہیں۔یہ جعلی ڈگری ہولڈرز جو سارا دن اور رات میرے وطن کو گدھ کی طرح نوچ رہے ہیں۔پارلیمنٹ کے نام اور کردار سے گھن آتی ہے۔سب لٹیرے اور ڈاکو اُس میں چھپے بیٹھے ہیں۔۱۹۷۴ء میں ایک کلمہ گو فرقے کو غیر مسلم کہنے والے بدکرداروں کے انجام پر نظر ڈالیئے۔(وائٹ پیپر از حکومت پاکستان ۱۹۷۸ء) ہائے یہ متقیان دین متین مسٹر ڈیزل اور باقی نابکار درندے۔جو اُسامہ اور طالبان کو شہید کہتے ہیں۔اصل مجرمان بیوروکریٹس کی خبر لیں کہ چیف سیکٹریز سے لے کر ڈی سی او ضلع تک جائیں۔اُن کی آمدنی،خرچ،لباس،سج دھج اور گاڑیاں دیکھیں۔اُن کی جائیدادوں کو چیک کریں۔مگر کون چیک کرے اس حمام میں سب ہی تو ننگے ہیں۔نہ یہ انسان ہیں نہ مسلمان ہیں۔اس کے بعد پولیس کے آئی جی اور ایس پی اور ایس ایچ او پولیس کا جائزہ لیں۔یہ اس معاشرہ کے لئے یزید اور خونخوار بھیڑیئے کا کردار ادا کر رہے ہیں۔تھانے فروخت ہوتے ہیں۔جس تھانے کا ماہانہ بھتہ بالا افسران تک کم جائے اس تھانے کا انچارج اُسی روز بدل دیا جاتا ہے۔جس جج کے ٹیبل پر پڑی فائل کو لاکھوں روپے کے پہیئے نہ لگیں۔اس کا فیصلہ لٹک جاتا ہے۔ہر نوکری کا ایک ریٹ ہے۔عام آدمی کو معلوم ہے۔تھانیدار اور تحصیلدار ڈائریکٹ بھرتی ہونے کے پچاس پچاس لاکھ تک لئے جاتے ہیں۔پی سی ایس آفیسر بھرتی ہونے کے لئے یا مقابلے کے امتحان پاس کرنے کے لئے کروڑوں تک روپے وصول کئے جاتے ہیں۔امیگریشن کا بزنس بھی بہت اعلیٰ ہے، بذریعہ ایان علی منی لانڈرنگ کے علاوہ۔ائرپورٹ سے لوگوں کو ویزے کے بغیر چڑھانے کا معاوضہ مزید ہے۔

آسٹریلیا،چالیس لاکھ،کنیڈا بیس لاکھ،یورپ انگلینڈ اٹھارہ لاکھ روپے،یعنی کہ ہر ملک کے ریٹس مقرر ہیں اور دن دیہاڑے یہ کام ہوتا ہے۔نچلے لیول پر پٹواریوں نے لوٹ مچا رکھی ہے۔کچہریوں میں مجسٹریٹوں اور ان کے کارندوں نے ضمانت لینے اور نہ لینے میں جو رشوت کا بازار گرم کر رکھا ہے کہ خدا پناہ۔جس کے پاس کوئی روپیہ ہے وہ تو بچ جاتا ہے۔جس کے پاس نہیں وہ جیل کی سلاخوں کے اندر پڑا پڑا سڑ جاتا ہے۔۔علمائے سُو۔آپ خود کسی عام شہری سے اس مخلوق پر تبصرہ کروائیے۔تو آپ اپنے کانوں کو ہاتھ لگانے لگیں گے۔لوگوں کو ٹیڑھا کرنے والا،اپنے ناقص علم کے زعم میں معصوم عوام کی سوچیں بدلنے والا،قبر پرست اور تعویز گنڈے سے لوگوں کو پاگل بنانے والا،دہشت گرد پیدا کرنے والا،جائز و ناجائز فتاویٰ دینے والا یہ نا ہنجار طبقہ سارے معاشرے کو بگاڑنے والا اصل مجرم ہے۔کیونکہ ان پڑھ عوام زیادہ راہنمائی اپنے محلے کے مولوی سے لیتے ہیں اور یہ مولوی یا نیم ملاں نے اپنے ناقص علم سے قوم کا بیڑا ہی غرق کر دیا ہے۔یہ پکی روٹی پڑھ کر قوم کی روٹی چھیننے والے طبقے نے ساری قوم کو misguide اور misuse بھی کیا ہے۔دین سے نابلد لوگ جب اس طبقے کے پاس راہنمائی کے لئے آتے ہیں تو یہ لوگ اپنی روزی روٹی چلانے کے لئے اپنی مرضی کا اسلام ان کے اذہان میں ٹھونستے ہیں۔اپنے علم سے بے خبر خود کے علاوہ سب کو کافر گردانتے ہیں۔فلاں مسجد میں نہ جانا وہ وہابیوں کی ہے۔وہ مسجد احمدیوں کی ہے وہ مسجد شیعوں کی ہے وغیرہ۔اصل میں اس طبقے کے منہ میں لگام ڈالنے کی ضرورت ہے،یہ طبقہ علمائے سُو معصوم عوام کو نام نہاد شریعت سے غلط متعارف کرواتا ہے،طلاق اور نکاح کا قوانین جن سے اس کی آمدن میں اضافہ ہو،بتاتا ہے،معصوم عوام کو مذہب کے نام پر misuse کرتا ہے۔اپنی من مانی قیمت وصول کرتا ہے۔خدا میری قوم کی آنکھ کھولے۔آمین۔

ہزاروں خواہشیں۔سفیر احمد

عورتوں سے زیادتی کے متعلق آئے دن خبریں پڑھنے اور سننے کو ملتی ہیں۔یقین جانئے بہت افسوس ہوتا ہے۔ایسی خبروں کے سننے سے دل بہت رنجیدہ ہوتا ہے،خود کو عموی طور پر عورتوں کے حق میں ہی پاتو ہوں اور یہ بھی مانتا ہوں کہ عورت مرد سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے(سوئے مثل پاور کے) صبر اور تحمل کا مادہ بھی عورتوں سے زیادہ پایا جاتا ہے۔شاید اس لئے اکثر مرتی بھی مردوں کے بعد ہیں۔دنیا میں اُنکی تعداد میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔تو پھر کیوں ہزاروں صدیوں سے ایسا ہوتا آ رہا ہے کہ نسل انسانی میں ظلم کا شکار عورت ہی ہوتی ہے۔آخر کیا وجہ ہے کہ کیوں اس نسل کی مونث بے اثر غیر موثر ہے؟ اور زیادتیوں کا شکار کیوں ہوتی ہے؟ جب کہ سارے جانداروں میں مادہ کا مقام نر سے کہیں زیادہ ہے۔ہر قسم کے جانداروں میں قانون اور حکم مادہ کا چلتا ہے۔نر جانور اکثر و بیش تر نکمے،نکھٹو ہوتے ہیں مادہ کی محنت اور کمائی پر ہی اپنے دن پورے کرتے نظر آتے ہیں مگر اشرف المخلوقات میں یہ بات ہی بالکل الٹ نظر آتی ہے آخر کیا وجہ ہے؟ یا شاید لاکھوں کروڑوں سال قبل ہی مردوں نے عورتوں کی کمزوریوں کو پا لیا ہوگا۔۔ میرے مطابق عورتوں کی سب سے بڑی کمزروی وفا اور یقین کے عنصر کا زیادہ ہونا ہے۔جو کہ دوسرے جانورں کی مادہ میں نہیں پایا جاتا۔وہ اپنے بچوں کو سب سے پہلے اپنے نر سے محفوظ کرتی ہیں کیونکہ اُن پر یقین کی حد تک شک کرتی ہیں شاید اُس وقت کے انسانی نروں سے دوسرے جانورں کے نروں جہانسوں کے چکر میں،عورت ذات، وفا اور یقین کے جہانسے میں آ گئی ہو۔پھر جوں جوں زمانہ بدلتا گیا عورت ذات کو قابو میں کرنے کے نت نئے نئے طریقے مرد ایجاد کرتا گیا۔کہیں پر اس کی نازک اداؤں کی وجہ سے کمزور ثابت کیا گیا اور پھر چار دیواری میں لپیٹ دیا گیا۔مرد عورت کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ مرد کی عزت اور غیرت کی اصل وجہ عورت ہے اس لئے اس کو نشانہ بنانے میں مرد کو آسانی رہتی ہے۔خود مرد ایک سے زیادہ عورتیں رکھنا چاہتا ہے اور رکھتا ہے۔لیکن عورت کا حق سلب کر رکھا ہے اپنے لئے ایسے قانوں وضع کر رکھے ہیں۔

اگر کوئی عورت چھوڑ کر جائے یا اُسے چھوڑ دے اُس کی واپسی کی سزا کا تعین کر رکھا ہے،مرد خود چاہے تو درجنوں عورتیں رکھلے۔لاکھوں سالوں کی غلامی کی وجہ سے اب حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے عورت ذات اپنے آپ کو کمزور اور ناتوں سمجھتی ہے۔خدا کے بعد مرد کو مجازی خدا کے درجہ پر رکھتی ہے۔اس دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں اُن پر عورتوں کے اندھے یقین اور غیر متزلزل اعتقاد کیوجہ سے ہی رونقیں اور بہاریں ہیں۔کسی مذہب کو ہی لے لیں اُس مردوں کا ہی کنٹرول ہوگا مگر اندھا اعتقاد عورتوں کا ہی ہوگا،حالانکہ مذہب میں اُس کی حیثیت کا تعین ہی مرد کرتا ہے۔ہندو مذہب آج تک عورت کو مندر جانے کی اجازت نہیں دیتا۔عورت مسجد نہیں جا سکتی اُن پر ممانعت تھی۔اور عبادت بھی منع تھی وجہیں اور تفصیلات بے شمار ہیں۔۔مختصر یہ کہ مذہبی مراد اُسے پلید سمجھتے تھے(اور ہیں) چند دن پہلے کی خبر ہے کہ ایک عورت نے جعلی پیر(نہ معلوم کے اصلی پیر کون سے ہوتے ہیں) کہ کہنے پر آ کر اپنے گیارہ سال کے بچے کو مار دیا۔جب پولیس نے جرح کی تو اُس نے کہا پتہ نہیں کیسے کچھ عرصہ پہلے اُس کی چار سالہ بیٹی بھی ہلاک ہو چکی ہے۔پیروں مقبروں خانقاہوں پر یقن سب سے زیادہ عورتیں ہی کرتی ہیں کبھی بچے مانگنے یا روحانی علاج کروانے والے پیروں کے نرغے میں اکثر آتی ہے۔جن ممالک میں ابھی جہالت عروج پر ہے وہاں پر عورتیں بالکلک محفوظ نہیں۔شرمین چنائے کی فلم کو بچی کے دریا میں ڈالنے ہر آسکر ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ابھی تو عورت کے اوپر ظلم کی لاکھوں سچی داستانیں موجود ہیں، اکثر شرمین کا سفر ایسے ہی جاری رہا تو بے شمار ایوارڈ اُس کے منتظر کھڑے ہیں۔ہمارے ملک میں موضوعات کی زرخیز زمین ہے۔جو آئندہ بھی دنیا کو حیران کرتی رہے گی۔جس پر ہم فخر کر سکتے ہیں۔دراصل شرمندگی اور بے عزتی کا مقام ہے ایک موضوع میں شرمین کو دئے دیتا ہوں۔اس پر بھی آسکر مل سکتا ہے بقول شاعر۔پھر کسی نے لکشمی دیوی کو ٹھوکر ماردی...آج ایک کوڑے دان میں پھر بچی مل گئی۔

جو ممالک ترقی کر گئے ہیں وہاں عورتوں کی حالت بہت بہتر ہے۔لیکن مردوں کے مقابلہ میں ابھی بھی صدیوں پیچھے ڈھکیلی ہوئی ہیں یورپ میں تو اکثر ممالک نے دوسری ورلڈ وار کے بعد عورت کو ووٹ کا حق دیا ہے۔یہ دُنیا صرف اور صرف مردوں کے لئے بنا دی گئی ہے عورت صرف ڈیکوریشن کے طور پر ہوتی ہے مفرورضے کے طور پر تصور میں سوچنے کے بات ہے۔اگر دوسرے جانوروں کو نر انسان کی اس سفا کی کا پتہ چلے تو انہوں نے اپنی ماؤں بہنوں بیٹیوں اور بیویوں کے ساتھ انتہا کا بُرا سلوک کر رکھا ہے تو وہ اپنے انسان نہ ہونے پر کتنے خوش ہوں گے۔یا شاید اُن سارے جانوروں کو معلوم ہو چکا ہوگا اسی لئے انسانوں کو منہ نہیں لگاتے وہ سارے ناراض اور دور ہی رہتے ہیں(سوائے پالتو جانورں کے) وہ سب کہتے ہونگے جو اپنی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کے سگے نہیں ہو سکے، ہمارے کیا ہونگے، تمام جانوروں نے اپنی ساری نسلوں کو صرف یہ نصیحت کی ہوگی بچو زندہ رہنا ہے تو انسان نما جانور سے کنارہ کش رہو۔اُن کی عورتیں مردوں پر اعتبار کرتی ہیں تو کریں، مگر تم مردوں پر اعتبار نہ کرنا۔

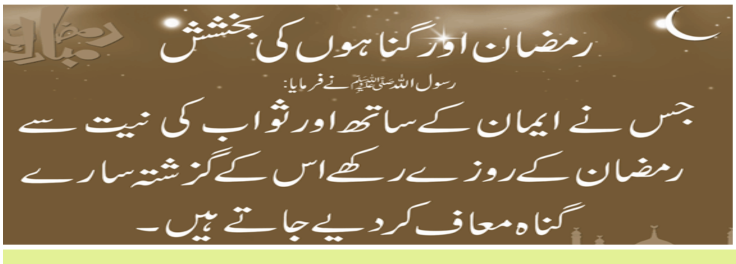

ساغر صدیقی

عاصی صحرائی

(یونس ادیب صاحب کی کتاب "شکستِ ساغر" سے اقتباس)

لاہور میں قیامت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ یہ جولائی کے دوسرے ہفتے کی بات ہے۔ ایک دوپہر میں ریڈیو اسٹیشن سے نکل کر لوہاری دروازے پہنچا تو مسلم مسجد کے مینار کے نیچے مجھے ساغر کی ایک جھلک دکھائی دی۔ اُس نے اپنے نحیف ونزار جسم سے سیاہ چادر اُتار دی تھی اور ڈھیلا ڈھالا سفید کرتا پہنے چھڑی کے سہارے کھڑا تھا۔ میں ٹریفک چیر کر اُس کی طرف بڑھا تو اُس نے دھونکی کی طرح چلتے ہوئے سانس کو روک کر مجھے دیکھا اور کہا "میں تمہیں ہی یاد کر رہا تھا کہ تم بھی نظارا کر لیتے اور ہاں تم ضرور پوچھو گے کہ فقیر نے سیاہ چادر کیوں اُتار دی ہے اور سفید کُرتا کیوں پہن لیا ہے؟" اور چھڑی دکھا کر بولا۔ "سب کچھ بتاؤں گا پہلے میری صلیب دیکھو"۔ یہ کہتے ہوئے پھر اُس کا دم اُکھڑنے لگا اور اُس نے کھانس کر بلغم تھوکی تو دم لے کر کفن نما سفید کُرتے کو چھو کر بولا۔ "مقتل کی طرف جانے کی گھڑیاں آ گئی ہیں اور میں نے کفنی پہن لی ہے۔" میں نے جلدی سے پوچھا" لیکن تم ہو کہاں؟" اُس نے اپنی بے نور ہوتی آنکھوں سے عینک اُتار کر پرے پھینک دی اور بولا" اب کچھ دیکھنے کو دل نہیں چاہتا اور جا بھی کہاں سکتا ہوں۔ صرف چولا بدلنے گیا تھا۔ اب تو میں نے سب تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔" ٹریفک کے شور میں ساغر کی آواز ڈوب ڈوب جاتی تھی۔ پھر وہ میرے آخری سوال کا جواب دیے بغیر لوہاری کے اندر اپنے لرزیدہ جسم کو کھینچ کر لے گیا۔ رات کو مجھے دیر تک نیند نہ آئی اور مجھے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے روشنی اپنے آپ کو سمیٹ رہی ہے۔

اُنہی دنوں طالب چشتی روتا ہوا ریڈیو اسٹیشن میں داخل ہوا اور اُس نے گلوگیر آواز میں بتایا "بابا جی خون تھوک رہے ہیں اور پان گلی کے باہر منیر چھولیاں والے کے تھڑے کے نیچے پڑے ہیں۔ میں کام جاری نہ رکھ سکا اور طالب کے ساتھ لوہاری پہنچا تو ساغر وہاں نہیں تھا۔ ہم نے انارکلی، ایبک روڈ، آبکاری روڈ، پیسہ اخبار، شاہ عالمی اور سوتر منڈی میں ہر جگہ اُسے تلاش کیا لیکن ساغر کا کوئی نشان نہ ملا۔ دوسرے دن میں ریڈیو اسٹیشن جانے کی بجائے صبح ہی صبح لوہاری چلا گیا اور اُسے مکتبہ جدید کے سامنے دیکھ کر میرا دم گھٹنے لگا۔ راہگیر اُسے دیکھ کر آگے بڑھ جاتے تھے اور دکان دار اپنے گاہکوں میں مصروف تھے۔ حالانکہ سارا شہر اُسے خون تھوکتے ہوئے اس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے لوگ اکھاڑے میں جمع ہوں اور خونیں منظر دیکھ کر تالیاں بجا رہے ہوں۔ جس میں ساغر کفن پہنے بوجھل سانسوں کے ساتھ نیم جان ہو کر اپنے آپ کو گھسیٹ رہا تھا۔ اُس کے کفن پر خون کے دھبے اس طرح جگمگا رہے تھے جیسے خنجر بکف جلاد اُس پر ٹوٹ پڑے ہوں۔

اُس نے بند ہوتی ہوئی آواز میں کچھ کہنا چاہا تو اُس کے منہ سے خون نکل کر اُس کے ہونٹوں پر پھیل گیا، اُس نے سفید آستین سے پونچھ کر دوبارہ کچھ کہنے کی آرزو کی تو خون کی لکیریں اُس کی کفنی پر بہنے لگیں۔ اپنے ہی خون میں شرابور ساغر صدیقی اس ہنستے بستے شہر میں کئی دنوں تک مقتل کا نظارا بنا رہا، اُس وقت ملک کی سب سے بڑی ادبی تنظیم رائٹرز گلڈ کے انتخابات پر پانی کی طرح روپیہ بہایا جا رہا تھا اور بہت سارے خوش حال ادیب اور شاعر رائٹرز گلڈ سے معذوروں کا وظیفہ بھی پا رہے تھے لیکن ساغر جس نے عمر بھر صلہ وستائش سے بے نیاز ہو کر حُسن و پیار اور رحم کے گیت تراشے تھے، اپنے خون آلود کُرتے میں لپٹا تیسرے دن بے کسی کے ساتھ مر گیا تھا۔

اُسے کس نے کفن پہنایا اور کون لوگ دفن کرنے قبرستان گئے۔ یہ شکستِ ساغر کی آخری گمشدہ کڑی ہے اور جس طرح کسی کو یہ معلوم نہیں کہ اُس نے کس ماں کی گود میں آنکھ کھولی؟ کس باپ کی شفقت سے محروم ہوا؟ اور کس بھائی نے اُسے پیار سے پکارا؟ اس طرح یہ بھی معلوم نہیں کہ اُسے قبر میں اُتارنے والے کون تھے؟

ساغر کو قبرستان میانی صاحب میں دفن ہوئے نو سال بیت گئے ہیں اور میں اُس کی زندگی کے بکھرے بکھرے مناظر ترتیب دیتے ہوئے اُس کی آخری آرام گاہ پر لگا ہوا ایک کتبہ پڑھ رہا ہوں۔ جس پر یہ الفاظ کندہ ہیں" عاشق کو سجدہ کرنے کی مستی میں اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ اُس کی پگڑی کہاں گری ہے اور اُس کا سر محبوب کے قدموں پر کس انداز سے گرتا ہے۔" لیکن اُس کے کسی مداح نے اُس کے کتبے پر یہ الفاظ لکھوائے ہوئے ہیں" ساغر کا قاتل یہ معاشرہ ہے" اور نیچے ساغر کا یہ شعر درج ہے۔ سنا ہے اب تلک واں سونے والے چونک اُٹھتے ہیں... صدا دیتے ہوئے جن راستوں سے ہم گزر آئے

دوستو! ساغر صدیقی کی فنی عبادتوں اور اُس کی پاکیزہ شخصیت کے خدوخال لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اُس کی زندگی میں جھانک کر دیکھنا میری ہمتوں سے باہر ہے۔ شکستِ ساغر کے عنوان سے اُس کی یادوں کو ترتیب دینا میری ایسی آرزو تھی جسے میں نے برسوں سے اپنے دل میں سنبھال سنبھال رکھا ہوا تھا۔ اور جب بھی میں اُس کے بارے میں لکھنے کے لیے قلم اُٹھاتا ہوں تو موتیوں کے پھولوں کی خوشبو میرے احساس میں پھیل جاتی ہے اور پھر اچانک ہی موتیوں کے پھول خون کے دھبوں میں بدل جاتے ہیں۔ قبرستان میانی صاحب کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے اکثر وہ ساغر صدیقی یاد آ جاتا ہے جو برسوں پہلے مجھے اس شہر میں ملا تھا۔ گھنگھریالے بالوں، خوبصورت آنکھوں اور خوبصورت چہرے والا ساغر صدیقی اور پھر ایک تباہ حال شاعر! جس کی میت پر کوئی اپنا آنسو بہانے والا نہ تھا۔ زندگی کی المناکیوں کا ایک ایسا عنوان بن گیا جس کو لکھنے کے لیے لہو کے چھینٹے اُڑانے پڑتے ہیں۔ شکستِ ساغر ایک فرد کا المیہ نہیں اس پورے سماج کا المیہ ہے جس سے بے رحم سرمایہ دارانہ نظام نے احساسِ دردمندی چھین لیا ہوا ہے۔ اور افراد کو ایک دوسرے سے اس طرح الگ کر کے رکھ دیا ہے کہ وہ بدترین حالتِ بیگانگی ذات میں مقید ہو کر رہ گئے ہیں۔

ساغر نے تمام زندگی دار ورسن پر گزاری۔ لیکن مرنے کے بعد اُس سے زندگی

کوئی بھی نہ چھین سکا۔ اُس نے تو اپنے لہو سے فکر وفن کا سنگھار کیا تھا۔ فاقوں کی سیاہ راتوں اور بے چارگی میں ڈوبی ہوئی صبحوں میں بھی اُس نے سچے خیالوں اور پُر نور جذبوں کے فانوس روشن رکھے۔ اُس نے بے گھروں کے دکھ میں اپنا گھر بنانے کے خیال کو جھٹک دیا۔ ننگے زخمی پیروں کو دیکھ کر خود تپتی ہوئی سڑکوں پر ننگے پاؤں جلتا رہا۔ برہنہ جسموں کی بے وقعتی پر سیاہ پوشی کرنے والے کے حوصلے کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ اور بھوکے معدوں کے غم میں فاقوں کے دوزخ میں جلنا اُسی کا کمال تھا۔ یہ وہ انسانی کمال ہے جو صرف آج کے بے برکت دور میں ساغر کی زندگی میں نظر آتا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو صدیوں تک اُس سے اہلِ درد کی محبتوں کو زندہ رکھے گا۔

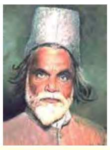

جگر مرادآبادی - عاصی صحرائی

مشاعرے کا ذکر جب بھی آتا ہے تو جگر مرادآبادی کا نام آنا ضروری ہے۔ کیونکہ آج تک کسی شاعر کو مشاعروں میں وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی جو جگر کو حاصل تھی۔ مرتضیٰ برلاس کا یہ لکھنا درست ہے کہ 'جگر جس شہر میں وارد ہوئے اس بستی کی راتیں جاگنے لگیں، اور لوگوں کے نظام الاوقات تبدیل ہو گئے۔ یہ ان کی شاعری کو بہت بڑا خراج عقیدت ہے اور اس میں کسی قسم کا شبہ بھی نہیں ہے کیونکہ جگر جس مشاعرے میں جاتے تھے چھا جاتے تھے لیکن ان کی شاعری کو صرف مشاعرے کی شاعری کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اسی لیے ان کی شاعری آج بھی زندہ ہے۔ جگر کا پیدائشی نام علی سکندر تھا اور وہ چھ اپریل 1890ء کو مرادآباد میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مقامی مکتب میں ہوئی تھی جہاں انہوں نے اردو اور فارسی کے علاوہ عربی کی بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ شاعری کا چسکا انہیں 12، 13 سال کی عمر سے ہی لگ گیا تھا۔ لیکن ان کے اس جذبے کو سب سے زیادہ اصغر گونڈوی نے مہمیز دی تھی اور اس کا اعتراف وہ خود بھی کرتے ہیں: ''میں مختلف مذہبی عقائد سے گزرتا رہا ہوں۔ ایک زمانے میں دہریت مجھ پر حاوی رہی۔ میں شیعیت کی جانب بھی رجحان رکھتا تھا۔ ان دنوں میں لاہور میں چشمے کی ایک فرم میں ملازم تھا جس کے ڈائرکٹروں میں شیخ عبد القادر بھی تھے۔ یہ زمانہ میرا دکھ اور روحانی اذیتوں کا تھا۔ آخر ایک روز میں حضرت اصغر گونڈوی کے پاس ان سے ملنے کے لیے گیا جو ایک صاحب سے بحث کر رہے تھے۔ میری دلچسپی نے دور ہی سے مجھے اس بحث کو سننے کے لیے روک دیا۔ میں قریب کھڑا اس طرح، کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکیں، تمام بحث سنتا رہا۔ عجیب بات یہ تھی کہ حضرت اصغر سمجھا رہے تھے اسے، اور میرے دل میں کانوں کے ذریعہ ہر ایک بات اُترتی جا رہی تھی ایسا بھی وقت آیا کہ جو شبہات میرے دل میں تھے میں نے سوچے اور تھوڑی دیر کے بعد ہی وہاں سے جواب ملا۔ وہ وقت مجھے یاد ہے جب میں تھوڑی دیر میں راسخ العقیدہ حنفی ہو گیا۔'' (ہمایوں لاہور، مارچ سنہ 1991 صفحہ 258)

حالانکہ جگر 15، 16 سال کی عمر میں ہی مے نوش ہو گئے تھے۔ لیکن اصغر کی باتوں کا ان پر اتنا اچھا اثر ہوا کہ انہوں نے شراب ترک کر دی اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ جگر کی زندگی میں بہت سے انقلابات آئے۔ ان کی زندگی بہت سے نشیب و فراز سے گزری۔ لیکن اپنی شاعری کے لیے انہوں نے جو روش طے کر لی تھی یعنی محبت۔ اس سے وہ کبھی الگ نہیں ہوئے۔ دنیا کی جفا یاد نہ اپنی ہی وفا یاد... اب کچھ بھی نہیں مجھے محبت کے سوا یاد جگر کی پوری شاعری غزل سے عبارت ہے۔ اگر انہوں نے کچھ نظمیں کہی بھی ہیں تو ان پر بھی تغزل کا رنگ حاوی ہے۔ لیکن ان کا اصل رنگ غزل ہی ہے جس کے بارے میں وہ خود ہی کہتے ہیں: ''میری شاعری غزل تک ہی محدود ہے۔ اب چونکہ حسن و عشق ہی میری زندگی ہے اس لیے بعض متزاد کو چھوڑ کر کبھی دوسرے میدان میں قدم رکھنے کی جرات نہ کر سکا۔'' جگر کے تین شعری مجموعے ان کی زندگی میں ہی شائع ہوئے۔ پہلا شعری مجموعہ سنہ 1922 میں ''داغِ جگر'' کے نام سے شائع ہوا جسے اعظم گڑھ کے احسان احمد وکیل نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اس پر مولانا عبد السلام ندوی نے تعارفی نوٹ لکھا تھا۔ دوسرا شعری مجموعہ ''شعلہ طور'' کے عنوان سے 1932ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا۔ اس کے نام کی شانِ نزول یہ تھی کہ مین پوری میں ایک طوائف شیرازن تھیں، جو بہت ہی مہذب اور باذوق خاتون تھیں۔ جگر کا قیام ان دنوں مین پوری میں تھا ان کی ملاقات شیرازن سے ہوئی اور جلد ہی گہرے تعلقات ہو گئے۔ وہ جگر کی شاعری کی دلدادہ تھیں اور اپنی مخصوص محفلوں میں زیادہ تر جگر کا ہی کلام سناتی تھیں۔ جگر اکثر ان کے گھر پر ہی پڑے رہتے تھے۔ ان کے لیے بالائی حصے پر ایک کمرہ مخصوص کر دیا تھا، جسے جگر صاحب ''طور'' کہا کرتے تھے۔ اسی لیے جب اس زمانے میں ان کا مجموعہ شائع ہونے لگا تو انہوں نے اس کا نام ''شعلہ طور'' رکھ دیا اور سرورق پر یہ شعر لکھا:

ہجومِ تجلی سے معمور ہو کر   نظر رہ گئی شعلہ طور ہو کر

ان کا تیسرا شعری مجموعہ ''آتشِ گل'' 1954ء میں ڈھاکہ سے شائع ہوا تھا۔ اس میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا طویل مضمون ''جگر میری نظر میں'' اور پروفیسر آل احمد سرور کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ 1958ء میں دوبارہ اسے انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا اور اس پر انہیں ساہتیہ اکیڈمی انعام بھی ملا۔ جگر کی شاعری عشق سے عبارت ہے۔ وہ عشق سے شروع ہو کر عشق پر ہی ختم ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں: یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے... اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔

کتاب عشق کا مشکل ترین باب ہوا
وہ ایک دردِ محبت جو صرفِ خواب ہوا
کس قدر جامع ہے میرا عالمِ تصویر بھی
حسن کی تشریح بھی ہے عشق کی تفسیر بھی
تفسیرِ حسن و عشق جگر مصلحت نہیں

افشائے رازِ قطرہ و دریا نہ کیجیئے
اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں
وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ
یہ ہے عشق کی کرامات یہ کمال شاعرانہ
ابھی منہ سے بات نکلی ابھی ہو گئی فسانہ
کیا کشش حسنِ بے پناہ میں ہے
جو قدم ہے اسی کی راہ میں ہے
نگاہوں سے بچ کر کہاں جایئے گا
جہاں جایئے گا ہمیں پایئے گا

جگر مراد آبادی کسی کی تقلید کے قائل نہیں تھے، اسی لیے انہوں نے آغاز میں ہی اپنی روش طے کر لی تھی جو دوسرے شعراء سے الگ ہے۔ وہ خود ہی لکھتے ہیں:

''ہوسکتا ہے میرے کلام میں کہیں کہیں مومن کا اثر غیر شعوری طور پر موجود ہے۔ لیکن واضح رہے کہ میں تقلید کا قائل نہیں۔ البتہ اس کا اعتراف ہے کہ میرے ابتدائی کلام پر داغ کا نمایاں اثر موجود ہے۔ غالب کی عظمت اور محبت میرے دل میں ہے لیکن مقلد اُن کا بھی نہیں۔'' (سہ ماہی اردو، کراچی، جولائی۔ سنہ 1959 صفحہ۔ 145)

جگر مراد آبادی کا انتقال نو ستمبر 1960ء کو گونڈا میں ہوا تھا اور وہیں انہیں محمد علی پارک میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ لیکن جگر کی موت کی خبر دو دو بار اخبارات میں شائع ہوئی اور ریڈیو سے بھی نشر ہوئی۔ اس کے بعد ان کے عقیدت مندوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ پہلی بار چار مئی سنہ 1938ء کو جب ان کے موت کی خبر شائع ہوئی تو بعض اخبارات نے خاص نمبر تک شائع کر دیے۔ ہر جگہ تعزیتی جلسے ہوئے۔ دہلی کی جامع مسجد میں تو تعزیتی جلسے کے ساتھ ساتھ نمازِ غائبانہ بھی ادا کی گئی۔ لیکن چند دنوں بعد لوگوں کو یہ جان کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ جگر بقید حیات ہیں۔ سنہ 1958ء میں جب جگر کو دل کا شدید دورہ پڑا تو اس وقت بھی ان کے انتقال کی خبر ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ کے اخبارات میں شائع ہوئی۔ لاہور اور کراچی میں متعدد تعزیتی جلسے ہوئے۔ لاہور کے ایک جلسے کی صدارت احسان دانش نے کی تھی۔ اس خبر کی تردید ہونے کے بعد مشہور مزاح نگار شوکت تھانوی نے روزنامہ ''جنگ'' میں لکھا تھا کہ پہلی خبر کے بعد جگر صاحب کی عمر بیس سال بڑھ گئی تھی اور اب اس خبر کے بعد پھر کم از کم بیس برس کے اضافے کی توقع ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا نو ستمبر 1960ء کو ان کو دل کا دورہ پڑا اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

جان کر من جملہ خاصانِ مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

پہلا گناہ

افسانہ

امجد مرزا امجد

دروازے میں چابی گھومنے کی آواز آئی تو میرے دل کی دھڑکن کوئلے والے ریلوے انجن کی مانند تیز ہوگئی اور اس کی دھمک سے میرا جسم کانپنے لگا۔ میں اُٹھا اور فرنٹ روم سے باہر نکل آیا اتنے میں سیمی میرے پاس آ پہنچی تھی۔ ''ہائے ڈیڈ...'' اس کے منہ سے شراب کی بو کا بھبکا میرے نتھنوں کو جلاتا ہوا میرے پھیپھڑوں کی دیواروں میں پیوست ہوگیا اور میرا سانس رکنے لگا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے تھامتے ہوئے فرنٹ روم کے صوفہ پر بٹھا دیا۔ اور خود سامنے کے سنگل سیٹ پر جا بیٹھی

''دیکھو ڈیڈ!'' اس نے اپنا کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی طبیعت اچھی نہیں رہتی۔ مگر آپ میرے لئے جاگ کر مزید پریشان ہوتے ہیں... کیوں نہیں سمجھتے کہ میں انیس سال ہوں اور اپنا اچھا بھلا بہتر سمجھتی ہوں۔ اگر رات کو دیر ہو جائے یا کسی دوست کے ہاں رات ٹھہرنا بھی پڑے تو آپ کو فکر نہیں کرنی چاہیے۔'' ''مگر سیمی! تمہیں علم ہے کہ جوان بیٹی کو اس طرح رات گئے تک گھر سے باہر رہنا زیب نہیں دیتا۔ ہم آخر مسلمان ہیں۔ تمہیں پاکستان اسی لئے لے گیا تھا تا کہ تم اچھائی برائی کی تمیز کرسکو۔ دیکھو۔'' میرے لہجے میں عاجزی تھی۔ ''بیٹے اگر تمہیں کوئی بھی لڑکا پسند ہے تم اس کے ساتھ شادی کرسکتی ہو میرا تعاون شامل ہوگا۔ مگر اس طرح رات بھر باہر رہنا...'' میرے لہجے میں ایک عاجزی در آئی تھی۔ سیمی سات برس کی تھی جب اس کی ماں ہمیں چھوڑ کے ایک کالے حبشی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ میں نے اسے ماں اور باپ بن کر پالا۔ اسے پاکستان لے گیا تا کہ وہ مشرقی رسم و رواج سے آشنا ہو۔ چھ سال تک ہم وہاں رہے مگر جب وہ روتی ہوئی مجھ سے آن لپٹتی اور شکایت کرتی کہ اسکول میں اور خاندان کے بچے اسے اس کی ماں کے طعنے مار کر تنگ کرتے ہیں تو میں شرم سے گنگ ہو جاتا... یہ سچ ہی تو تھا۔ اس وقت مجھ پر جوانی کا نشہ تھا جس میں انجام کا احساس نہیں ہوتا۔ مارگریٹ کو جب پتہ چلا کہ میرا اپنا مکان ہے اچھی بھلی تنخواہ ہے اور اکیلا ہوں تو وہ جونک بن کر رہ گئی۔ مجھے یہ فخر تھا کہ گوری مجھے دل دے بیٹھی ہے۔ مگر اس نے مجھے سال بعد ایک خوبصورت بھورے آنکھوں والی اور کالے بالوں والی گوری چٹی بیٹی دے دی۔ میں گورے رنگ کی چمڑی کے نشے میں رہا اور میرے چراغ کے نیچے اندھیرا ہی رہا۔ اور پھر ایک دن وہ کسی کالے کے ساتھ کسی دوسرے شہر بھاگ گئی اور سیمی کو میرے پاس چھوڑ کر چٹ لکھ گئی کہ مجھے امید ہے تم اس کی پرورش مجھ سے بہتر کرو گے۔ پاکستان کے رشتہ داروں کے طعنوں سے مجبور اور سیمی کے مستقبل کے لئے میں پھر انگلینڈ آ گیا... مگر افسوس کہ مشرقی ماحول میں رکھ کر بھی سیمی کے اندر ماں کے دودھ کا اثر پہاڑی ندی کی مانند شونکتا مشرقی روایات کو روندتا اسے ایسی سمت

بہائے لے جارہا تھا کہ میں اس کے آگے کوئی بند نہ باندھ سکا۔اس نے میری جانب بڑے پیار سے دیکھا اور بولی۔''ڈیکھو ڈیڈ! مجھے آپ سے بہت محبت ہے کہ آپ نے مجھے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا۔میں یہ احسان زندگی بھر نہ بھلاؤں گی مگر...سچائی کو فراموش مت کرو...یہ بات اگر ایک گوری رنڈی کو ایک پب (شراب خانے) سے پانچ دس پونڈ کے عوض لانے سے پہلے سوچی ہوتی تو آپ آج اتنے پریشان نہ ہوتے...پاکستان رہ کر بھی مجھے وہاں کے لوگ یہی سمجھاتے رہے کہ میں ایک شراب خانے کی وحشیہ عورت کی بیٹی ہوں جو مجھے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔اب اگر اسی ماحول میں آ کر گو میں وہی کچھ نہیں کرتی جو میری ماں کرتی تھی مگر...یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ میں ایک انگریز کی بیٹی بھی ہوں۔۔اور مجھے آپ پھر اسی ماحول میں لے آئے جہاں کسی انگریز لڑکی کے لئے ایسی باتیں گناہ نہیں۔'' میں سوچ رہا تھا وہ سچ کہتی ہے...پہلا گناہ تو میرا تھا...!!

چیف جسٹس انور ظہیر جمالی کی چشم کشا باتیں

اے آر خان

چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان انور ظہیر جمالی صاحب نے کراچی میں جوڈیشنل ایجوکیشنل سیمینار کے موقع پر بروز ہفتہ خطاب فرمایا کہ ہمارا اور ساری قوم کا رویّہ منفی ہو گیا ہے۔ہم اپنے حقوق کو یاد رکھتے ہیں اور فرائض کو یکسر بھول جاتے ہیں مقننہ، عدلیہ، انتظامیہ اپنا کردار ادا کرنے میں ناکام رہی ہے۔بنیادی انسانی حقوق کی سخت پامالی ہو رہی ہے۔گھمبیر مسائل قیام پاکستان سے ہیں مگر اب تو شدت اختیار کر چکے ہیں۔الیکشن اصلاحات سارے ممالک میں ہو چکی ہیں مگر اس ملک میں ابھی تک یہ بائیو میٹرک کا طریقہ رائج نہیں ہوا جو کہ دھاندلی روکنے کے لئے بہت حد تک موثر ہے ۔ہر پارٹی جمہورت کا نعرہ لگاتی ہے مگر اس کے اپنے اندر جمہوریت نہیں بلکہ آمریت ہے ۔انسانی حقوق کی پامالی، صحت کے اداروں کی کارکردگی صفر ہے، تعلیمی ادارے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں ناکام ہو چکے ہیں۔عدلیہ کے جج صاحبان انگریزی زبان سے ناواقف، پیشہ ورانہ صلاحیت سے نابلد، وغیرہ وغیرہ۔دیکھا جائے تو چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان انور ظہیر جمالی صاحب نے ساری قوم کو جگانے کی کوشش کی ہے اور ان ساری انتظامیہ، مقننہ، عدلیہ، اشرافیہ، بیوروکریٹس، سیاسی لیڈران، نام نہاد محب وطن، اور اسلام کے نام نہاد ٹھیکیداروں، اسلامی نظریاتی کونسل کے بھاری بھرکم مولاناؤں، بزعم خود امیر المومنین، نہ جانے کیا کیا، ان سب کے منہ پر یہ بیان ایک تمانچے سے کم نہیں۔جہاں عام آدمی نہیں ایک قوم کے سپریم کورٹ کا جسٹس چلا رہا ہے ۔اور کسی کے کانوں تک جوں نہیں رینگتی۔اور نہ ہی رینگے گی۔کیونکہ ہمیں تو اپنی تجوریوں کو بھرنا ہے۔دولت کو اکٹھا کرنا ہے۔

انسانی حقوق، غریب عوام اور ان کی صحت، اور مزید سہولیات جائیں بھاڑ میں۔قوم کیوں کسی نجات دہندہ کی منتظر ہے، جب ظلم حد سے بڑھ جائے۔جب بے انصافی ہو، جب قانون کی حکمرانی نہ ہو، جب جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا وقت آ جائے، جب انصاف وعدل کی فائلوں کو قائد اعظم والے نوٹوں کے پہیئے لگانے پڑیں۔جب ہر صاحب اقتدار بھیڑیئے کا رُوپ دھار لے، نفسا نفسی کا عالم ہو، کمزور کو دھتکارا جائے، عالم جہلاء کا کردار اپنا لیں۔جعلی ڈگری کا راج ہو، ہر شاخ پہ اُلّو بیٹھا ہو، قوم کے امین خائن ہو جائیں، مشتاق رئیسانی جسکے بزرگ کبھی ساربان تھے۔اونٹ چراتے تھے ان کے گھر سے اربوں روپے اور اربوں روپے کا سونا برآمد ہو، مسٹر ڈیزل مفتی اسلام بن جائے، اور اس کے بھائی کو اٹھارہ گریڈ سے راتوں رات ترقی دے کر کمشنر مہاجرین ایکس گریڈ دے دیا جائے، کیپٹن صفدر جس کا ممتاز قادری سے نا معلوم کونسا گہرا رشتہ تھا، کہ ان کے پرستار بن گئے، یا شاید گورنر سلمان تاثیر کو قتل کروانے میں انہی کی سازش ہو، اور انکو پوچھا تک نہ جائے، ایسا ملک جس میں دن دیہاڑے ڈاکے پڑیں، اغوا برائے تاوان کے واقعات سرعام ہوں، جہاں قوم کو جعلی دوائی اور گدھوں کا گوشت کھانا پڑے، جہاں ہر چیز میں ملاوٹ ہو جہاں، کلمہ گو جماعت کو اپنی انا پرستی کی خاطر کافر کہا جائے، جہاں مساجد میں بم گرانا کارِ ثواب ہو، نمازیوں کا قتل عام ہو، پھر ان کی قبریں تک اُکھاڑ دی جائیں، وطن کی لاش کو بھی گدھ کی طرح نوچا جائے، جہاں ہر چیز اور ایمان تک میں ملاوٹ ہو، اس قوم کا علاج بلکہ پوسٹ مارٹم لازم ہے، اس میں شک نہیں کہ چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان انور ظہیر جمالی صاحب نے قوم کی نبض کو تو سمجھ لیا ہے۔اور نبض شناسی کے ماہر لگتے ہیں۔اب نباض کا کام ہے کہ اس کے علاج کی طرف بھی توجہ بھی دے۔اب گیند بھی اُن کے کورٹ میں ہے۔برائے مہربانی پانامہ لیکس کے حوالے سے سب حرام خوروں کے متعلق ایک بورڈ قائم کر کے کوئی دس ہزار حقیقی قصورواروں کو لٹکانے کا حکم کچھ مہینوں میں صادر کر دیں انصاف کے مطابق۔قوم کی تطہیر بھی ہو جائے گی۔اور کرپشن میں بھی کمی ہو جائے گی۔اور دولت جو بیرون ممالک گئی ہے واپس لائی جائے۔

کوئی مردِ مومن ہے تو آئے میدان میں۔انصاف کرے یا شہید ہو۔قوم کی تربیت اور اصلاح فوری کرنے کی ضرورت ہے۔اس قوم کو چند کرپٹ عناصر نے سیاست اور اسلام کے نام پر اغوا کر لیا ہے۔یہ پاکستان کے حامی نہیں یہ پاکستان کو ہڑپنا چاہتے ہیں۔یہ غدارانِ وطن ہیں۔یہ RAW کے ایجنٹ ہیں یہ ایمان فروشوں کا گروہ ہے۔ان کو بر وقت پکڑیں۔یہ انکل سام کے گماشتے اور ٹاؤٹس ہیں، ان کے چہرے مت دیکھیں ان کے کرتوت دیکھیں۔یہ لوگ اپنے اثر ورسوخ سے آپ کے ڈرائنگ روم تک پہنچ چکے ہیں۔کسی نے اسلام کا رُوپ دھار رکھا ہے کسی نے اسلام آباد کا، ان بھیڑیوں کو پکڑیں ، وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور میرا وطن سارے عالم میں بدنام ہو کر رہ گیا ہے۔خدا میرے وطن کو ان یزیدوں اور ہامانوں سے بچائے، خدا تعالیٰ ان شاطروں، چالبازوں، احسان فراموشوں، چنگیزوں، ہلاکو وں، ایرانی شاہوں، قذافیوں، حسنی مبارکوں، ظالم اور حریص بدمعاش شریفیوں سے بچائے اور ان کے محل گرائے۔آمین

نماز کی اہمیت

سید حسن خان

اسلام کی عبادت بالمقابل دوسرے مذاہب کے

اسلام میں نماز ایک ایسی عبادت ہے جس کی نظیر کسی بھی اور مذہب میں نہیں ملتی۔ اسلام کے علاوہ اور مذاہب میں عبادت کے انداز اور طور طریقے بھی ایسے بودے قسم کے ہوتے ہیں جن کے کرنے سے انسان میں نیکی اور پرہیز گاری کا پیدا ہونا تو در کنار خدا تعالیٰ کی نصرت یا رضا بھی حاصل ہونا ناممکن ہے۔ بلکہ بعض مذاہب میں تو خدا تعالیٰ کی عبادت ایک رسم کے طور پر کی جاتی ہے۔ اس کے مقابل پر اسلام میں عبادت حقیقی اور خدا تعالیٰ کو پانے کا ذریعہ ہے۔ اور نماز ہی ہے جس سے بندے کا اپنے خالق حقیقی سے تعلق پیدا ہوتا ہے اور پھر خدا اپنے بندے کی مرادیں بھی پوری کرتا ہے۔

بانیٔ اسلام ہمارے پیارے آقا و مولیٰ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا ہے کہ۔

ا۔نماز جنت کی کنجی ہے۔ ۲۔الصلوٰۃ عماد الدین۔ (نماز دین کا ستون ہے)

نماز نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ نماز نیکی کا مغز ہے۔ نماز ہی ہے جس سے ایک مسلمان خدا کو پاتا ہے۔ اور اپنے پیدا کرنے والے کی رضا حاصل کرتا ہے بلکہ اس کے فضلوں اور رحمتوں کے حصول کا ذریعہ نماز ہے۔ نماز ایک مومن کا معراج ہے۔ جس سے وہ خدا کے قریب ہوتا ہے۔ اگر نماز کی اہمیت اور اس کی ادائیگی کی طرف غور کیا جائے تو انسان حیران ہوجاتا ہے کہ واقعی نماز ایک ایسی عبادت اور حرکت ہے جس کی مثال کسی بھی مذہب میں نہیں ملتی۔ اور جب ایک نمازی نماز پڑھنے کے لئے خدا کے حضور کھڑا ہونے کے لئے تیاری ہی کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کے فرشتے اس کے حق میں ثواب کے درجات لکھنے شروع کردیتے ہیں۔ سب سے پہلے انسان کی نیت ہے، جب ایک سچا مسلمان عبادت بجالانے کے لئے نیت ہی کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کے فرشتے اُسی وقت اس کی ایک نیکی ثواب کے طور پر لکھ لیتے ہیں۔ مثلاً نماز کی ادائیگی کے لئے جب ایک مسلمان وضو کرنے سے پہلے بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم پڑھ کر پانی کا استعمال شروع کرتا ہے تو اس کی ہر حرکت جو بھی وضو کرتے وقت کی جاتی ہے اس کا علیحدہ علیحدہ ثواب ہے۔ دوسرے وضو کے بارہ ایک بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ جب بھی وضو کیا جائے تو تین کے ہندسے کو ہر وقت مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے۔ فرض کیا آپ نے بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم پڑھ کر ہاتھ دھونے شروع کئے ہیں تو یہ نہ ہو کہ ہاتھ دھونے شروع کئے ہیں تو تین کی بجائے ایک یا دو بار ہی ہاتھ دھو کر منہ میں پانی ڈالنا شروع کردیں۔ نہیں بلکہ ہاتھ تین بار دھوئیں پھر تین بار منہ اور ناک میں پانی ڈالکر منہ اور ناک کی صفائی کریں۔ فرض کیا آپ کا منہ تین بار پانی ڈالنے سے نہیں دھویا گیا تو یہ نہیں کہ آپ چار بار یا پانچ بار منہ کی کرولی کریں اور اسی طرح ناک میں پانی ڈالکر ناک صاف کرنی شروع کردیں نہیں بلکہ اگر منہ کے اندر کوئی چیز پھنسی ہوئی ہے اور آپ کو بار بار دھونے پڑتے ہیں تو پھر۔ جب منہ اچھی طرح صاف ہوجائے تو پھر سے تین کی گنتی کو پوری کریں۔ اسی طرح ناک کی صفائی ہے۔ جب تک ناک صاف نہیں ہوجاتی دھوئیں اور پھر تین کی گنتی پوری کریں۔ اس طرح آپ نے پورا وضو کرنا ہے۔ گویا وضو کا ایک علیحدہ ثواب ہے۔

دراصل وضو کے کرنے سے انسان کی پہلے ظاہری صفائی مدِّ نظر ہے پھر اپنے پیدا کرنے والے خدا کے حضور حاضر ہوکر عبادت بجالانا مقصود ہے۔ نیز وضو کے دوران کلمہ شہادت،

أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ پڑھنا ہوتا ہے۔ جس سے پھر وضو مکمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد نمازی کھڑے ہوکر نماز شروع کرتا ہے۔ مگر اس کے مقابل پر جب ہم دوسرے مذاہب کی عبادات پر نظر ڈالیں تو ان کی عبادات کے بارہ ان کی کتب میں ان کی عبادت بجالانے کے بارہ میں کوئی بھی ایسا حکم ان کی کتابوں میں نہیں ملتا ہے۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہی صحیح اور مناسب عبادت بجالانے کی صحیح ترکیب کی راہنمائی فرمائی ہے۔ اس بارہ پیارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفی ﷺ کی حدیث ہے کہ:

''حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''آدمی کی جماعت کے ساتھ نماز گھر میں یا بازار میں پڑھنے سے پچیس درجہ زیادہ بہتر ہے وجہ یہ ہے کہ جب ایک شخص وضو کرتا ہے اور اس کے تمام آداب کو ملحوظ رکھ کر اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر مسجد کا راستہ پکڑتا ہے اور سوائے نماز کے اور کوئی دوسرا ارادہ نہیں ہوتا تو ہر قدم پر اس کا ایک درجہ بڑھتا ہے اور ایک گناہ معاف کیا جاتا ہے۔ اور جب نماز سے فارغ ہوجاتا ہے تو فرشتے اس وقت تک اس کے لئے برابر دعائیں کرتے ہیں جب تک وہ اپنے مصلّے پر بیٹھا رہے، کہتے ہیں اے اللہ اس پر اپنی رحمتیں نازل فرما، اے اللہ اس پر رحم کر اور جب تک تم نماز کا انتظار کرتے رہو گویا تم نماز ہی میں مشغول ہو۔'' (بخاری کتاب الاذان، باب فضل صلاۃ الجماعۃ)

نماز کی اہمیت کا اس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب نماز کے لئے ایک مسلمان نیت ہی کرتا ہے تو اس کا ثواب خدا تعالیٰ کے فرشتے لکھنا شروع کردیتے ہیں۔ پھر جوں جوں ایک مسلمان نماز کی ادائیگی تک جو بھی لوازمات پورے کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کے حضور نیکیاں لکھی جارہی ہوتی ہیں۔ مثلاً جب ہم پاک صاف ہوکر وضو کرکے ایک پاک جگہ کو منتخب کرتے ہیں تو اس کا بھی اپنا ثواب ہے۔ نماز کی تیاری میں جو جو بھی ہم حرکت کرتے ہیں اس کا ثواب ہے۔ مگر اس کے مقابل پر دوسرے مذاہب میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ نیز اسلام میں مسجد کے علاوہ ساری زمین خدا تعالیٰ کی مسجد

ہی کہلاتی ہے۔فرض کیا ایک مسلمان سفر میں ہے یا کسی ایسی جگہ پر ہے تو وہ خدا تعالیٰ کی سرزمین پر کہیں بھی نماز پڑھ سکتا ہے نیز اس دوران اگر پانی نہ ملے پھر بھی خدا کے حضور صرف تیمم کرکے نماز پڑھ سکتا ہے۔مگر اس کے مقابل پر دوسرے مذاہب میں عبادت کے لئے مخصوص جگہیں ہوتی ہیں جہاں پر عبادت کی جاتی ہے۔اسلام میں سب نمازی ایک ہی طرف رُخ کرکے عبادت کرتے ہیں یعنی خدا کے گھر خانہ کعبہ کی طرف جو مکہ مکرمہ میں ہزاروں سال سے قائم و دائم ہے۔سوائے یہودیوں کے جو یوروشرم کی طرف منہ کرکے عبادت کرتے ہیں۔اس کے علاوہ کسی اور مذہب میں عبادت کرنے کے رُخ کی کوئی بھی جگہ مقرر نہیں۔

جہاں تک نماز کی ادائیگی کا تعلق ہے۔نماز شروع کرتے وقت جب ہم نماز شروع یا نیت کرنے کی دعا پڑھتے ہیں۔گویا جب ہم نماز شروع کرتے وقت اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے کانوں پر لگاتے ہیں اس وقت ہم اِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔پڑھ کر نماز شروع کرتے ہیں تو پھر جو طریق اسلام نے بتایا ہے اس پر عمل کرتے ہیں تو اس کا الگ ثواب گنا جاتا ہے۔اور پھر اس پر زائد یہ کہ جیسی جیسی ایک مسلمان کی ایمانی حالت ہوتی ہے اس کے مطابق وہ نماز میں اپنے پروردگار سے التجائیں کرتا ہے اور وہ نمازی جس کیفیت اور حالت میں خدا تعالیٰ کو پکارتا ہے اس کی ہر حالت کے مطابق خدا تعالیٰ اس کو اجر دیتا ہے اور اسی کے مطابق اس کی نیکیاں خدا تعالیٰ کے فرشتے لکھتے جاتے ہیں۔اس نمازی کی التجائیں فرشتے پھر خدا تعالیٰ کے حضور جاکر پیش کرتے ہیں۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ نماز میں ہی دعائیں کرنی چاہئیں بلکہ نماز ہی ایک سچے مسلمان کا فعل ہے جس میں اپنے پروردگار سے مانگنا چاہئے نا کہ نماز ادا کرنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا، جیسا کہ ہمارے غیر احمدی بھائی نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعائیں کرتے ہیں۔یہ فعل بالکل غلط ہے۔

ہر نمازی کی ایمانی حالت مختلف ہوتی ہے۔اسی لیے کہتے ہیں بعض لوگوں کی ساری زندگی کی نمازیں کسی کی ایک دن کی نماز سے بھی کم پڑ جاتی ہے۔خدا تعالیٰ نے نماز ادا کرنے کو سب سے بڑی نیکی قرار دیا ہے۔وہ اس لئے کہ نماز واحد نیکی ہے جس کا تعلق صرف اور صرف خدا اور بندے سے ہے۔جس میں بندہ اپنے ربّ اور پیدا کرنے والے سے پردہ میں بات کرتا ہے اور اس سے تضرعات کرتا ہے۔اور اپنی ہر امنگ کو اپنے پیدا کرنے والے ربّ کے آگے گڑگڑا کر مانگتا ہے۔اور بندے کا ربّ جو انسان کی پاتال تک نظر رکھتا ہے۔اپنے بندے کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے۔اور نا صرف وہ اپنے بندے کی دعاؤں کو سنتا ہے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اس کا بندہ آئندہ بھی اسی طرح اپنے ربّ کے آگے جھکتا رہے اور بجائے کسی انسان کے آگے ہاتھ پھیلانے کے اپنے پیدا کرنے والے واحد خدا سے مانگے۔جو اسے دیتا بھی ہے اور اس کی دعاؤں کے بدلہ اس شخص کو اپنا مقرب بھی بنا لیتا ہے۔جہاں تک دوسرے مذاہب کی عبادات کا اور ان کے پیدا کرنے والے خدا سے ہے۔ان کے مذاہب میں ایسی کوئی تعلیم نہیں ہے کہ وہ اس طرح اپنے خدائے پاک ذوالجلال سے مانگے جیسا کہ ایک مسلمان اپنے خدا سے مانگتا ہے اور جو ایک مسلمان کو اپنے خدا کے آگے جھکنے کی تعلیم دی گئی ہے۔اور نہ ہی دوسرے مذاہب میں دعاؤں کے مانگنے کا تصور پایا جاتا ہے۔اگر دعائیں مانگتے بھی ہیں تو خدا تعالیٰ نے جو تعلیم اپنے پیارے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو دی ہے وہ کسی اور نبی کو نہیں دی۔کہ کیسے اس کے حضور حاضر ہو کر خدا کے قرب کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ سب مسلمانوں کی نمازوں کا معیار قطعاً ایک جیسا نہیں ہے۔جیسا کہ جو نمازیں ہمارے پیارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تھیں یا حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ کی تھیں یا ہمارے بزرگان کی تھیں۔ان کی نمازیں بیشک عام مسلمانوں سے بالکل الگ رنگ رکھتی ہیں۔کہا جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک دفعہ کسی جنگ میں دشمن کی طرف سے تیر لگا تو آپ نے فرمایا کہ جب میں نماز کی حالت میں ہوں تو اس کو نکال لینا۔گویا ان کو نماز میں اتنا استغراق تھا کہ آپؓ کے فرمان کے مطابق آپ خدا کی عبادت میں اتنے مگن ہوتے تھے کہ آپ کو خدا تعالیٰ کی ذات کے علاوہ دنیا و مافیہا کا خیال تک نہیں رہتا تھا۔یہی حال تقریباً ہر صحابی کا تھا۔مگر آنحضرت ﷺ کی نمازوں کا تو یہ حال تھا کہ آپؐ نماز میں خدا کی یاد میں اتنے مگن ہوتے تھے کہ آپ کے پاؤں مبارک سوج جایا کرتے تھے۔قرآن مجید میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۔یعنی اے رسول (ﷺ)! تم پر ہم نے دین کو مکمل کردیا ہے۔گویا اسلام کے آنے سے تمام دینوں کی اب بالکل اہمیت ضرورت بھی نہیں رہی۔اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو تمام مذاہب کا منبع ہے۔اسلام ہی تمام مذاہب کا مجموعہ ہے۔اسی طرح ہم مسلمانوں کو اس بات پر فخر ہے کہ جو نماز یا عبادت اسلام میں ادا کی جاتی ہے وہ کسی اور مذہب میں نہیں پائی جاتی۔

ڈاکٹر عبدالغفار عزم پی ایچ ڈی مرحوم

کوثر علی

اُردو تحریک عالمی کے بانی، شاعرِ لندن، اُردو زبان سے شدید محبت رکھنے والے ہردلعزیز ڈاکٹر عبدالغفار عزم پی ایچ ڈی یکم مئی اتوار کی دوپہر کو نارتھ مڈل سیکس یونیورسٹی ہسپتال میں انتقال فرما گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس ناگہانی موت کی خبرسُن کر لندن اور یو کے کے ادبی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ کاروانِ اُردو کا پاسبان ہی چلا گیا اور ڈر رہے کہ اب یہ کاروان کہیں منتشر ہی نہ ہو جائے۔ ڈاکٹر عبدالغفار عزم مرحوم نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ اُردو زبان کی خدمت میں صرف کیا۔ وہ ناگپور بھارت سے ہجرت کر کے کراچی پاکستان تشریف لائے تھے۔ کراچی کی لا یونیورسٹی سے بی اے ایل ایل بی کی ڈگری اعلیٰ نمبروں پاس کی اور انہیں سکالرشپ ملا۔ جس پر وہ ۱۹۶۸ ء میں لندن آئے۔ اور ISOAS فریقن اسٹڈیز یونیورسٹی میں قانون میں Phd کی۔ اس کے بعد بطور قانون دان پرائیویٹ پریکٹس شروع کی۔ لندن میں مستقل رہائش پذیر ہو گئے۔ ڈاکٹر عبدالغفار عزم کو چونکہ اُردو زبان سے بے حد محبت تھی۔

چنانچہ ۱۹۶۸ میں ہی آپ نے اُردو تحریک کی تنظیم شروع کی۔ پاکستانی اور دو انگریزوں کو بھی اس میں شامل کیا۔ جو اس سال کی سٹوڈنٹ یونین کی نوازشوں کی بدولت تمام سوسائٹیوں میں سب سے زیادہ فعال اور مقبول رہی۔ پہلے سال ہی اردو کے اچھے خاصے پروگرام پیش کرنے میں کامیاب رہی جس کا ذکر اُس وقت کے اخبارات میں پایا جاتا ہے۔ اُردو سوسائٹی کے بعد ازاں مقامی اُردو سوسائٹی کے طالب علم رچرڈ ہیرس اور پیٹر استراس اور پروفیسر ترآت کے نام آتے ہیں جنہوں نے اُردو سوسائٹی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ رچرڈ ہیرس کے اُردو لب ولہجہ پر اہلِ اردو کو ناز ہوا کرتا تھا۔ جنہوں نے بعد ازاں فلم سازی کا کارنامہ بھی سرانجام دیا۔ اس دوران ایک اور ہونہار طالب علم محمود جمال جو اپنی صلاحیتوں، تحریری و تقریری، باوصف، نیز فلم سازی، بولیوڈ میں کافی معروف ہیں۔ اُن دنوں تین چار کافی نمایاں و معروف کامیاب مشاعرے اُردو تحریک کو کروانے کا شرف حاصل ہوا۔ اُردو تحریک عالمی کا نمایاں کام جو اس کی پہچان بن چکا ہے وہ اس کی ماہانہ نشستیں ہیں جو شروع سے بلاناغہ ہر ماہ کے پہلے جمعہ کو soas کے تعاون سے منعقد ہوتی ہیں ان نشستوں کی اپنی انفرادیت ہے۔ یہ دو نشستوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ پہلا حصہ نثری ہوتا تھا جسکی خصوصیت اس کا انتقادی پہلو ہے۔ یعنی کہ تخلیقات و نگارشات کے بعد ان پر کھل کر تنقید اور تبصرے کا دور ہوتا ہے اور یہ امر باعث مسرت ہے کہ تنقید اپنا مقام اور اہمیت رکھتی ہے۔

اُردو تحریک کے بانی کا دوسرا بڑا کام اُردو ٹرسٹ کا قیام ہے۔ جس کی بنیا ۱۹۹۶ء میں رکھی گئی۔ نیز ۱۹۹۷ میں اُردو ٹرسٹ کو چیرٹی ہونے کا استحقاق حاصل کرانے کا کام بھی ان ہی کی ان تھک کاوشوں کا نام ہے۔ اُردو ٹرسٹ کے اغراض و مقاصد تعمیری ہیں اور افادیت کے حامل ہیں۔ اسی طرح اُردو ٹرسٹ کا بڑا کارنامہ ۲۰۰۰ء میں اور ۲۰۰۲ء میں بڑی بڑی کانفرنسیں کروانا ہیں۔ جس میں پہلی دفعہ ۲۹۔ اور دوسری دفعہ ۲۳ بین الاقوامی مندوبین نے شرکت کی۔ پہلی کانفرنس ڈاکٹر وحید قریشی کی زیر صدارت بھی ایک مقام رکھتی ہے۔ ۲۰۰۰ء کی کانفرنس کا مجلہ روئیداد، جس میں شرکاء کے مضامین، دیگر کارگزاریوں پر مشتمل ایک یادگاری حیثیت رکھتا ہے۔

اُردو تحریک کے منعقدہ سیمینار میں دنیا کے دوردراز ممالک مشرق وسطیٰ، نیروبی، جرمنی، فرانس، کنیڈا، امریکہ، روس، سے پروانوں کا چلے آنا اُردو زبان سے والہانہ لگاؤ کا ثبوت ہے۔ اور اس شمع کو جلانے والے ڈاکٹر عبدالغفار عزم کا نام ابد تک زندہ رہے گا۔ (نقش اول)

شعرگوئی پر وہ مکمل عبور رکھتے تھے۔ شعرگوئی کی ہر صنف پر ان کی مکمل دسترس تھی۔ ان کے کلام میں اُردو غزل کے مقام کی وضاحت ان کے اس شعر سے عیاں ہے۔

میرے شوق کے سفر میں نہ ابد ہے نہ ازل ہے
میری ابتدا غزل ہے میری انتہا غزل ہے

انہیں نوجوان نسل میں اُردو کے فروغ کا شوق اور قدر اُجاگر کرنے کی بہت خواہش تھی۔ اس خواہش کے فروغ کے لئے انہوں نے حال ہی میں ایک نشست قائم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ کہ یونیورسٹی کے طلباء جن کو اُردو سے لگاؤ ہے انہیں ماہانہ ادبی نشست میں مدعو کر کے اُردو انگریزی نظموں کا ترجمہ و تشریح پیش کی جائے تا کہ ان طلباء میں بھی شوق پیدا ہو تو اس طرح اُردو کی ترویج و ترقی ہو۔ وہ نئی نسل کے ادبی ذوق کو اردو کی بقا کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی امید کے ساتھ ان کو اعتماد تھا۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

ازل سے چلتا آیا عزمؔ ابد تک جائے گا چلتے
نہ ہم ہونگے تو کیا غم ہے ہمارا کارواں ہوگا

یونیورسٹی آف لندن سے گولڈ میڈل حاصل کرنے والے پہلے پاکستانی قانون دان ڈاکٹر عبدالغفار عزم ماہر ادبیات ولسانیات زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں بہت بڑا ذخیرہ رکھتے تھے، وہ شعر و سخن کے سمندر تھے ان کی معلومات بہت وسیع تھیں مگر اُن کی نگارشات منتشر رہیں، جنکو مرحوم نے مجتمع نہیں کیا۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''نقشِ اوّل'' جو سلیم الدین قریشی مرحوم کی کوششوں سے منظر عام پر آیا تھا۔ یہ مرحوم کے منتخب اشعار کا مجموعہ ہے۔ یہ انتخاب ان کی مختلف غزلوں کا اجمالی خاکہ ہے۔ مرحوم ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔۔ اُردو ادب کے روشن چراغ کے بجھ جانے سے برطانیہ کے ادبی حلقوں کو بہت نقصان ہوا ہے۔ مرحوم جیسا اُردو

زبان کا دلدادہ، عاشق اُردو، دیوانہ اُردو، باعمل مجنوں اُردو مشکل سے ملے گا۔

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ وَر پیدا

مورخہ ۶ مئی کو ایک تعزیتی اجلاس ایس او اے ایس یونیورسٹی کے کمرہ نمبر جی ۵۱ میں جناب رضا علی عابدی، انجم رضا، صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں ۴۰ ادیب و شعراء نے عبدالغفار عزم کے بارے میں توصیفی کلمات کہے اور ان کی اردو زبان کی خدمات کے حوالے سے بہت سراہا گیا۔ اُن کی تدفین مورخہ ۱۲ مئی کو ہے جس کا وقت جلد ہی بتا دیا جائے گا۔ اس رعزیتی اجلاس میں شرکاء کے نام یہ ہیں۔ قمر مرتضیٰ قریشی، انجم رضا صاحب، رانا عبدالرزاق خاںِ، رضا علی عابدی، ایوب اولیاء، مظفر احمد مظفر، ڈاکٹر نجیب، احسان شاہد، عابدہ لال، فرزانہ فرحت، حمیدہ معین رضوی، کوثر علی، عادل فاروقی، رحیم اللہ شاد، آفتاب صاحب، نور جہاں نور صاحبہ، زاہد اسلم، کرشن بدنت موجود، طارق نیوز رائٹر، غالب ماجدی، سلطان صابری، محمد سلیم، شیخ شجاع، شہاب صاحب، امان اللہ، محمود علی محمود، سلمان سعود، سجاد کھوکھر، ڈاکٹر سمن، ثروت اقبال، عامر خان، ارجمند صاحب، فرحت جعفری۔

مورخہ ۱۳ مئی کی دوپہر کو مرحوم کا جنازہ PALMERS GREEN MOSQUE پڑھا گیا۔ اور ILFORD کے قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔ سوائے زیادہ اُن کے پرستاروں، ادباء، شعراء نے ان کی آخری رسومات ادا کیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بلانے والا ہے سب سے پیارا   اُس پہ اے دل تو جان فدا کر

ملالہ یوسف زئی - حسن نثار

سوات کی بچی ملالہ یوسف زئی کے حوالہ سے جتنی نفرت پڑھے لکھے طبقے میں پائی جاتی ہے شاید کہیں اور نہ ہو ان کے پاس ملالہ کے خلاف ہزاروں جواز موجود ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک نئے سازشی تھیوری۔ دنیا اگر ان کو دہشت گردی کے اعلیٰ درجے پر فائز کرے تو بھی بری اور اگر ہماری کسی بہادر بچی کو سلام کرے تو بھی سازش۔ ہمیں ہر وقت خطرہ ہی لگا رہتا ہے ہمارے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ حیران ہوتا ہوں کہ کیا دنیا کو اس ملک کے خلاف سازشیں کرنے کی ضرورت ہے؟ جہاں اٹھارہ گھنٹے بجلی نہیں ہوتی، جس کی آبادی بیس کروڑ سے زائد ہو چکی، تیزی سے بڑھ رہی ہے اور کسی نے اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہ ہو۔ جو آئی ایم ایف سے تازہ تازہ سات ارب ڈالر کا قرضہ لے کر آیا ہو۔ جس میں چالیس ہزار لوگ مارے جانے کے بعد بھی بحث ہو رہی ہو کہ یہ جنگ امریکہ کی ہے یا ہماری۔ جہاں قاتلوں کے حق میں بھی دلیلوں کے انبار ہوں۔ جہاں تخت سے اُترتے ہی نیب کی ہتھکڑیاں تیار ہوں۔ جہاں تین سالہ بچی تک کو ریپ کیا جاتا ہو...اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔

چوراہا

حسن نثار

اُڑتے مگرمچھ اور رینگتے عقاب

جب کسی جگہ پر آزادی رُخصت ہوتی ہے تو وہ یک دم نہیں جاتی بلکہ وہاں پر تمام ترخوبیوں کے خاتمے پر ہی کوچ کرتی ہے۔ ہم نے بڑی محنت اور لگن اور کوششوں سے پہلے اپنا آدھا ملک گنوایا پھر بھی اپنے اُلجھنوں چال چلن، طور اطوار پر غور نہیں کیا بلکہ اپنی مزید حماقتوں سازشوں لالچوں جہالتوں لاپرواہیوں سے باقی ماندہ ملک بھی انرجی کرائسس کی پروان چڑھا کر اپنی صنعتوں کو برباد اور اپنے لوگوں کو بے روزگار کیا۔ ہمارے سارے المیے ہماری خامیوں کے پٹارے سے ہی پھوٹ رہے ہیں۔ ہمارے ''سیاسئے'' پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے اور ''عوامیے'' آگے بڑھنے کی بصیرت سے محروم اور ملک چل رہا ہے، خدا کے سہارے! ایسی جگہوں پر آزادی نہیں بربادی راج کرتی ہے۔ جادو ٹونے تو ہوتے ہیں لیکن پریم گیت کہیں سنائی نہیں دیتے دہشت وحشت و بربریت کی داستانیں تو رقم ہوتی ہیں امن و امان نہیں رہتا۔ نشاط کی کلیاں نہیں کیکٹس پروان چڑھتا ہے قریہ قریہ بستی بستی شیطانوں کا قبضہ ہوتا ہے خفیہ ہاتھ کام دکھاتے ہیں ایسی بربادیوں میں سب کچھ عجیب وغریب ہوتا ہے مگرمچھ اُڑتے پھرتے ہیں اور عقاب رینگتے ہیں۔ ہر عمل کا ردعمل اور جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات ہی ہوتی ہے۔

ایسی تمام خرابیوں اور خرافاتوں کے خاتمے اور خوبیوں کی ترویج اور اہتمام سے آزادی وعزت وقار حاصل ہوتا ہے۔ ہمارا ایسی خانہ خرابیوں کی جانب واپسی کو کب سفر شروع ہوگا؟ یہ سفر کہاں سے شروع ہوگا؟ مگرمچھ کب تک اُڑتے اور عقاب کب تک رینگتے رہیں گے؟

حسن نثار اور فوج:

فوج کا قصور نہیں وہ ٹیک اوور کرتی ہے فوج کا قصور یہ ہے کہ وہ ٹیک اور کے بعد سپولوں (چھوٹے سانپ) کو اپنے فوجی ڈیرے فارمز کا خالص دودھ پلاتی ہے پھر جب جب وہ سانپ بن جاتے ہیں تو فوج اُن کو عوام کے گلے میں ڈال دیتی ہے یہ اب باتیں کر رہے ہیں جمہوریت کی۔ یہ فوجی بوٹوں میں اُگنے والی پنیریاں ہیں جو آج تنا آور درخت بن گئے ہوئے ہیں درخت بھی وہ جو انسانی خون چوستے ہیں۔

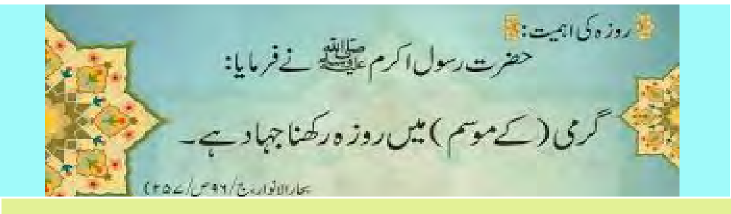

ماہ و سال کا شاعر
اکبرؔ حیدر آبادی

اسحاق ساجدؔ (جرمنی)

میرا یہ منصب نہیں کہ میں جناب اکبرؔ حیدر آبادی کے کلام پر اپنی رائے دوں لیکن میں یہ اعتراف کرنے سے باز نہیں رہوں گا کہ اکبرؔ حیدر آبادی ہمارے عہد کی ایک اہم آواز ہیں۔ وہ محض لفظوں کی جگالی نہیں کرتے بلکہ لفظوں کے ہجوم میں نرم و نازک کومل و نزل الفاظ چن کر انہیں معنی دیتے ہیں اور یہ فیصلہ تو وقت ہی کرے گا کہ ان کی شاعری اور ادب میں کیا مقام ہے اور آنے والا وقت یہ بھی بتائے گا کہ کون کہاں کھڑا ہے۔ اکبرؔ حیدر آبادی کی شاعری روائت وجدت کا ایک دلکش امتزاج ہے۔ آپ کی شاعری پڑھ کر یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اکبرؔ حیدر آبادی جنت سے آیا ہوا وہ درخت جس پر کبھی خزاں نہ آئیگی اور جس کی چھاؤں میں نسلیں بیٹھ سکیں گی اور ایک عالم اس پہ مہکتے ہوئے طرح طرح کے پھلوں کا ذائقہ اپنی روح میں محسوس کر سکے گا۔

غزل صرف میٹھی عمر کے رسیلے جذبات کے اظہار تک محدود صنفِ سخن کا نام نہیں بلکہ غزل کی نمایاں خصوصیتِ حیات وکائنات کے جملہ مسائل کا بہ زبان عشق ادا کرنا ہے۔ اکبرؔ حیدر آبادی کی شاعری پڑھ کر لگتا ہے جیسے محبت ہی زندگی ہے۔ آپ ایک فطری شاعر ہیں، پختہ گو شاعر اور صاحبِ دل شاعر۔ آپ کی شاعری میں تخیل کی نادرہ کاریاں اور فکر کی بلندیاں پائی جاتی ہیں۔ ہر شخص جو اردو یا ادب سے تھوڑی بھی سمجھ رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ اردو شاعری کی اصناف میں غزل ایک ایسی صنف ہے جو بین لاقوامی ادب میں اپنا مقام بنا چکی ہے اور اس لحاظ سے اکبرؔ حیدر آبادی کی غزل گوئی بھی اسی خصوصیت کی ضامن ہے۔ ان کی شاعری میں مساوات کا جذبہ ہے فرقہ پرستی سے نفرت ہے۔ انسان دوستی اور آپسی اتفاق۔ محبت ان کا مذہب ہے اور ایسی زندگی کو لعنت قرار دیتے ہیں جہاں نفرت کا دور دورہ ہو۔ اکبرؔ حیدر آبادی کی شاعری صرف حسن وعشق کی واردات قلبی یا محرومی و ناکامی تک محدود نہیں۔ ان کی شاعری کا بغور مطالعہ کریں تو ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ کہیں کہیں آپ کے اشعار میں طنز کی کاٹ بہت تیز ہے۔ آپ نے ہر موضوع کو بڑے فنکارانہ انداز میں برتا ہے۔ کہیں بھی آپکے اشعار کے تاثر میں کمی نہیں آئی ہے۔ زندگی کی حقیقتوں کو موصوف نے اپنے اشعار میں جس سادگی اور خلوص سے بیان کیا ہے یقیناً اس سے ان کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ میں ذاتی طور پر آپکی شاعری کا مداح ہوں اور ایک عرصہ سے آپ کی تخلیقات رسائل میں دلچسپی سے پڑھ رہا ہوں آپ کے اشعار میں متوازن رویہ نظر آتا ہے اور یہی ایک کامیاب شاعر کی دلیل ہوا کرتی ہے۔ آج کے کامیاب شعرا میں ایک بہتر نام اکبرؔ حیدر آبادی ہے۔ اکبرؔ حیدر آبادی کی نظموں کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہے ان کے ہاں غمِ دوراں ہی ہے اور غمِ جاناں بھی۔ غمِ دنیا اور غمِ یار کو انہوں نے شاعری میں ایک ساتھ سمو کر اپنے شعری اظہار کو دوآتشہ کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی نظمیں قاری کو نئے آفاق کی سیر کراتی ہیں۔ لفظوں کی مزاج شناسی اور انہیں تخلیقی انداز سے برتنے کا فن کوئی اکبرؔ حیدر آبادی سے سیکھے۔ اکبرؔ حیدر آبادی ایک باصلاحیت شاعر ہیں اور شاعری ان کی فطرت میں رچی بسی ہے اور پھر شاعری کو انہوں نے ذریعہ شہرت نہیں بنایا انہوں نے صرف اپنے ذاتی تجربوں کو عصری تناظر میں پیش کیا ہے۔ اکبرؔ حیدر آبادی ایک بے حد حساس دل، منور فکر اور روشن ضمیر رکھتے ہیں ان کے ایک ایک لفظ میں کئی داستانوں کا جہاں روشن ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ کہ آسان اور سادہ زبان میں شعر کہتے ہیں جنہیں سمجھنے کے لئے زیادہ دماغ پر زور نہیں دینا پڑتا۔ آپ کی شاعری میں عصری حسیت کی لے اتنی تیز ہے کہ ہم انہیں بلاشبہ جدید حسیت کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔

اکبرؔ حیدر آبادی کی شاعری میں زندہ رہنے کی لگن، جوش و ولولہ جیسی مثبت قدروں کا بھی برملا اظہار ہوا ہے۔ ویسے تو اکبرؔ حیدر آبادی پر منہ زبانی بھی مضمون لکھا جا سکتا ہے لیکن وہ کسی اسپرنگ پہ قدم رکھ کر اتنی بلندی پہ نہیں گئے بلکہ یہ کہنا پڑے گا کہ انہوں نے یہ مقام لمحہ لمحہ بنایا ہے۔ آخر پہ میری دعا ہے خدا تعالیٰ مزید توفیق دے اور وہ اردو کی مزید خدمت کر پائیں۔ میں ہمیشہ ان کے دعا گو ہوں۔

خواب آنکھوں میں ٹوٹ جاتے ہیں
سہیل احمد کی شاعری

جناب عابد حسین عابد سیکٹری جنرل انجمن ترقی پسند مصنفین پنجاب لاہور سہیل احمد کی کتاب ”خواب آنکھوں میں ٹوٹ جاتے ہیں“ کے متعلق رقم طراز ہیں کہ:

”جس طرح بارود، دھواں، دھماکے، اور قتل وغارت وادیءِ کشمیر کے حسن کو متاثر نہ کر سکے۔ اسی طرح کشمیری النسل سہیل احمد کے احساسات، جذبات کی خوب صورتی یورپ کی آسودہ زندگی کے اثرات سے محفوظ ہے۔ وہ معاشرے میں خوبصورتی کا متلاشی ہے۔ جسے اس کتاب کی بنیادی اکائی قرار دیا جا سکتا ہے۔ انسان کو دُکھی نہ دیکھ سکنے والا یہ شاعر، خونی رشتوں کی مانند پڑتی ہوئی کشش پر بھی رنجیدہ ہے۔ اس کی شعری کائنات، یادیں، محرومیاں، دُکھ، وطن سے محبت اور دوری کے احساس پر مشتمل ہے۔ ہم اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ آسمانوں، خلاؤں، یا اَن دیکھی دنیاؤں کی دریافت سہیل احمد کا مطمح نظر نہیں۔ وہ جس زمین کا باشندہ ہے وہ اسی کو خوبصورت بنانے کے خواب دیکھتا ہے ایک زندہ شخص کی آنکھوں میں خواب ٹوٹ تو ضرور سکتا ہے مگر اس کا زندہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ٹوٹے خواب کو جوڑ کر ایک نیا خواب تشکیل دینے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ دراصل سہیل احمد کی شاعری اور نثر پارے ٹوٹے خواب کو جوڑنے کی کوشش ہے۔ جسے اس نے متاثر کن بیانیے کے ساتھ بڑی ہنر مندی سے بیان کیا ہے“۔

(عابد حسین عابد سیکٹری جنرل انجمن ترقی پسند مصنفین پنجاب لاہور)

جستہ جستہ ۔ عاصی صحرائی

چونا:: دنیا میں پان والا واحد انسان ہے جو پوچھ کر چونا لگاتا ہے۔

زندگی میں مختلف ادوار کے مشروبات::

۱۔کنڈر گارٹن۔۲۔ پرائمری۔ جوس۔۳۔ ہائیسکول۔ پیپسی۔۴۔کالج۔ریڈ بُل۔ یونیورسٹی۔سٹاربکس۔۵۔دوران سروس۔چائے۔۶۔ ریٹائرمنٹ کے بعد۔دم کیا ہوا پانی۔

اُدھار:: مجھے اُدھار دینے اور اُدھار لینے والوں نے تباہ کر دیا۔ادھار دینے والوں نے مجھے اپنے قدموں پر کھڑا نہ ہونے دیا اور اُدھار لینے والوں نے میرے قدموں کے نیچے زمین نہ رہنے دی۔

یہ وقت بھی:: بادشاہ نے وزیر کو انگوٹھی دی اور کہا اس پر کوئی ایسا فقرہ لکھوا لاؤ جسے میں خوشی میں پڑھوں تو اداس ہو جاؤں اور غم میں پڑھوں تو خوش ہو جاؤں، وزیر گیا اور انگوٹھی پر یہ فقرہ لکھوا لایا ''یہ وقت بھی گزر جائے گا''۔

انٹرٹینمنٹ:: میں اپنے کتے کو نہلاتا جاتا تھا اور سوچتا جاتا تھا، یہ میرا Pet ہے یا میں اس کا Pet ہوں۔آپ نے کبھی یہ سوچا، ہوسکتا ہے آپ کے کتے نے آپ کو اپنی انٹرٹینمنٹ کے لیے رکھا ہوا ہو، آپ اس کے Pet ہوں۔

بھنورا:: سائنسدان کہتے ہیں، بھنورے کا جسم بڑا اور پر بہت چھوٹے ہوتے ہیں لہٰذا یہ سائنسی لحاظ سے اُڑ نہیں سکتا، شاید بھنوروں نے سائنسدانوں کی یہ بات نہیں سنی تھی، شاید یہ اسی لیے اُڑتے پھرتے ہیں، انسان اگر سیکھنا چاہے تو یہ ان بھنوروں سے بھی سیکھ سکتا ہے، آپ خود سوچیں اور خود کریں، ناممکن صرف وہ ہے جس کو آپ نے ناممکن مان لیا ہے ورنہ اگر بھنورے بھی سائنسدانوں کی بات سن لیتے تو یہ بھی کبھی نہ اُڑ سکتے۔

تنہائی:: ہم ایک دن میں اوسطاً 2250 لفظ بولتے ہیں، دنیا میں کل تین ارب ای میلز روزانہ بھیجی جاتی ہیں، انسان 19 ارب ٹیکسٹ میسجز بھجواتے ہیں، سات ارب سے زیادہ لوگ اس دنیا میں آباد ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اکیلا پن محسوس کرتے ہیں، ہم نے یہ تمام کمیونیکیشن ٹیکنالوجیز ایک دوسرے کو قریب لانے کے لیے ایجاد کی تھیں، فاصلے کم کرنے کے لیے بنائی تھیں مگر آج کا انسان پہلے سے بھی زیادہ تنہا ہے، کیوں؟ کیونکہ کوئی سائنس اج تک انسانی آواز، انسانی لمس، شفقت کے ہاتھ، تھپکی یا گرم مصافحے کا نعم البدل نہیں بنا سکی، انسان کا اکیلا پن صرف انسان ختم کر سکتا ہے اور آج انسان کو انسان ہی میسر نہیں۔

ہوشیاری:: میں نے اس سے کامیابی کی وجہ پوچھی، وہ بولا ''میں نے زندگی میں صرف ایک ہوشیاری سیکھی'' میں نے پوچھا ''کیا؟'' وہ بولا ''دنیا کی سب سے بڑی ہوشیاری یہ ہے، تم زندگی میں کبھی ہوشیاری نہ کرو، تم کامیاب ہو جاؤ گے''۔

جاب لیس:: مالکوں نے جس دن خود کو ملازمین کی صفوں میں رکھ لیا اس دن دنیا کا کوئی شخص جاب لیس نہیں ہوگا اور جس دن ورکروں نے ملازم رکھنا شروع کر دیے اس دن کوئی کمپنی بند نہیں ہوگی۔

دلچسپ:: ہم دنیا کو اچھے اور برے لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں، ہم روز مایوس ہوتے ہیں، ہم اگر دنیا کو دلچسپ اور بور لوگوں میں تقسیم کر لیں تو ہم کبھی مایوس نہیں ہوں گے۔

مقدر:: محنت درخت ہوتی ہے اور مقدر پرندہ، آپ جب تک درخت نہیں اگاتے، جب تک آپ کا درخت بڑا اور گھنا نہیں ہوگا، اس وقت تک مقدر کا پرندہ آپ کے درخت پر نہیں بیٹھے گا۔

کمبی نیشن:: میں نے زندگی میں دیکھا، جہاں پھول تھے وہاں کانٹا بھی تھا اور جہاں کانٹا تھا وہاں خوشبو بھی تھی۔

قاتل:: لوگ سمجھتے تھے سیٹھ صاحب کو معاشی پالیسیوں نے برباد کر دیا مگر ان کے ملازمین کا کہنا تھا ''سیٹھ صاحب پالیسیوں کے ہاتھوں نہیں اپنے غرور کے ہاتھوں مارے گئے تھے''۔

آمریت:: وہ کہہ رہے تھے، ہمیں ایک مضبوط ڈکٹیٹر چاہیے، میں نے ہاں میں سر ہلایا اور ان سے عرض کیا ''جناب آپ دنیا کے سو سال کی تاریخ پڑھیے اور مجھے وہ ملک دکھائیے جس نے ڈکٹیٹرشپ میں ترقی کی ہو''، وہ تھوڑی دیر سوچتے رہے اور پھر خاموش ہو گئے۔

افضل:: ماں بچے کو پیدا کرتے وقت جتنی تکلیف برداشت کرتی ہے، باپ بچوں کو پالتے وقت اس سے کہیں زیادہ تکلیف پوری زندگی سہتا ہے لیکن اس کے باوجود باپ کے پاؤں صرف پاؤں ہیں جنت نہیں؟ ایک سوال!۔

پچھلی سیٹ:: یورپ میں صاحب ڈرائیونگ کرتے ہیں، میم صاحبہ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتی ہیں اور میم صاحبہ کا کتا پچھلی سیٹ پر...یہاں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

نصیب:: ہم بھی بڑے دلچسپ لوگ ہیں، گاڑیاں بنانے والی کمپنیاں ڈرائیونگ سیٹ سب سے اچھی بناتی ہیں اور ہم یہ سیٹ اپنے ڈرائیور کو پیش کر دیتے ہیں، خوش نصیب ڈرائیور ہوا یا ڈرائیور کا صاحب۔

تبدیلی:: ملک میں حقیقی تبدیلی اس دن آئے گی جس دن اللہ دتہ اسمبلی میں بیٹھ کر وزیر خزانہ اسحاق ڈار کے گھر کا بجٹ بنائے گا۔

(دنیا میگزین 18 اکتوبر 2015ء)

مشاعرہ

بزمِ اُردو برطانیہ

رپورٹ: رانا عبدالرزاق خاں

بزم اُردو برطانیہ جوکہ غالباً بیس سال سے قائم ہے۔جس کے صدر جناب رضا علی عابدی اور جنرل سیکٹری غالب ماجدی ہیں،اُردو زبان کی ترویج کے لئے مسلسل کوشاں رہتے ہیں۔ حسب معمول اس بار بھی اس تنظیم نے مورخہ ۳۰/اپریل کو ساؤتھ ومبلڈن میں مشاعرے کا اہتمام کیا۔جناب تسلیم الٰہی زلفی کو کنیڈا سے،شفیق مراد کو جرمنی سے سیما غزل کو کراچی سے اور مہ جبیں غزل انصاری اور فاروق ساغر کو برمنگھم سے شمولیت کی باقائدہ دعوت دی گئی۔ساؤتھ ومبلڈن ٹیوب اسٹیشن کے قریب ہی ائر ٹریننگ کور کا ہال بک کیا گیا۔ساڑھے چھ بجے سے ہی مہمان آنا شروع ہوئے مگر مشاعرہ ساڑھے سات بجے شروع ہوا۔اس میں شرکت کرنے والے شعراء اور شاعرات کی تعدا پینتیس سے زائد تھی،جن کے اسماء یہ ہیں۔عقیل دانش،غالب ماجدی۔عابدہ شیخ،محمود علی،رحیم اللہ شاد، ابراہیم رضوی، مبارک کمال،فرزانہ فرحت،رخسانہ رخشی، احسان شاہد،تاجی محمود رانا،سہیل خلش، ساجد محمود رانا،رانا عبدالرزاق خان، عامر امیر ،عبدالمجید ظفر، سائرہ بتول،سیمی برلاس، عادل فاروقی،عبدالقدیر کوکب،حمیدہ معین رضوی،ناظر فاروقی،باسط کانپوری، نجمہ عثمان، مصطفی شہاب،غزل انصاری،ضرار خلش اینکر الاسلام ٹی وی چینل،فاروق ساغر،شفیق مراد،سیما غزل، مجلس کے رُوح رواں رضا علی عابدی بھی موجود تھے ۔ اور مہمان خصوصی جناب تسلیم الٰہی زلفی شامل ہوئے۔ پروگرام کا آغاز کلام پاکی تلاوت سے ہوا اور عقیل دانش نے اپنی نظامت کا حق جس حسن بیانی سے ادا کیا یہ اُن کا ہی حصہ ہے۔سب شعراء نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق رنگ بکھیرے۔ابھی کوئی پندرہ شعراء نے کلام پیش کیا تھا کہ وقفہ ہوگیا۔نماز مغرب کے وقفے کے بعد دوسرا سیشن شروع ہوا۔

مجلس مشاعرہ رنگ برنگے پھولوں کی خوشبو سے معطر تھا ۔گلستانِ بزم اُردو مہک اُٹھا تھا،کئی شاعرات نے اپنا شیریں کلام سنا کر مشاعرہ لوٹ لیا،۔ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا،اچھے اشعار کے قدردان موجود تھے۔جوں ہی خوبصورت اشعار کانوں میں آتے ، ہرطرف سے واہ واہ کے دونگڑے برسائے جاتے ۔اورشعراء کی حوصلہ افزائی کی جاتی ۔تالیوں کی آواز سے ہال بار بار گونج اُٹھتا۔آج کا مشاعرہ بزم اُردو مثالی اور بارونق تھا، کرسیاں کم پڑ گئی تھیں ۔ایک جم غفیر تھا۔اس مشاعرے کا کریڈٹ جناب صدر بزم اور اُن کی ٹیم کو جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس انتظامیہ کو مزید ایسے مشاعرے مستقبل میں کروانے کی توفیق دے۔آمین۔

تسلیم الٰہی زُلفی کے ساتھ ایک شام

رپورٹ:
عاصی صحرائی

محترمہ عابدہ لال ایک کہنہ مشق ادیبہ، شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں۔ مجھے اتوار یکم مئی کو بزم اُردو کے مشاعرے میں ملیں تو دعوت دی کہ مورخہ تین مئی کی شام کو اُن کے دولت خانہ والنگٹن سرے میں حاضر ہوں۔ ایک شام تسلیم الٰہی زُلفی کے ساتھ منانی ہے لہٰذا میں نے ساجد محمود رانا، قدیر کوکب، طفیل عامر کو بھی دعوت دے ڈالی۔ ہم سب بروقت عابدہ لال کے دولت خانہ پر پہنچے تو اُسی وقت غالب ماجدی صاحب کی گاڑی بھی آ کر رُکی۔ جس میں سے محترم شفیق مراد آف جرمنی اور تسلیم الٰہی زُلفی بھی اُترے۔ علیک سلیک کے بعد اندر داخل ہوئے تو محترمہ عابدہ لال نے بڑی خوشدلی سے استقبال کیا۔ محمود علی محمود بھی ہمارے ساتھ ہی پہنچے۔ چند منٹ کے بعد فرزانہ فرحت بھی پہنچ گئیں۔ محترم شفیق مراد کے برادر اکبر منظور شاد بھی کنیڈا سے بھی تشریف لائے تھے۔ وہ بھی موجود تھے۔ ساجد جو کہ عابدہ لال کے بھائی ہیں وہ بھی میزبانی میں ہاتھ بٹانے کے لئے موجود تھے۔

مشاعرہ آٹھ بجے عابدہ لال کی نظامت میں شروع ہوا۔ جنہوں غالب ماجدی، شفیق مراد، تسلیم الٰہی زُلفی کا تفصیلی تعارف پیش کیا اور سب شعراء کا بڑی خوشدلی سے استقبال کیا۔ شاعرہ ہونے کے ناطے انہوں نے اپنی ایک خوبصورت غزل پیش کی۔ پروفیسر عبدالقدیر کوکب نے وطن کے حوالے سے اپنے جذبات اشعار میں پیش کئے۔ ان کے بعد ساجد محمود رانا جو نوجوان نسل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ اپنا کلام پیش کیا۔ جسے بہت سراہا گیا۔ ان کے بعد طفیل عامر آئے جن کے پانچ مجموعہ ہائے کلام منظر عام پر آ چکے ہیں۔ برفیلی دھوپ، دُھپ کڑا کی، دستک سے تھکے ہاتھ، خواب سجائے پھرتے ہیں، ڈھانج تے ڈیک، ان کے نام ہیں۔ اُردو و پنجابی کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اُردو و پنجابی میں کلام سنایا تو سامعین بہت محظوظ ہوئے۔ اس کے وطن کے حوالے سے عاصی صحرائی نے اپنا کلام پیش کیا جسے سب نے سراہا، عابدہ لال نے پھر ایک نعت سنائی جو کہ بہت ہی دلکش تھی اس کے بعد فرزانہ فرحت نے اپنی دو غزلیں سنائیں۔ ان کا ایک مجموعہ کلام منظر عام پر آچکا ہے۔ اب جناب غالب ماجدی کی باری تھی۔ انہوں اپنا مرصع کلام سنا کر اور پھر زمانے پر ایک غزل سنا کر سامعین کو باغ باغ کر دیا، شفیق مراد ایک منجھے ہوئے شاعر ہیں ان کی باری آئی تو سب عش عش کر اُٹھے۔ اس کے بعد کنیڈا سے تشریف لائے ہوئے جناب مہمانِ خصوصی تسلیم الٰہی زُلفی کی باری تھی۔ جن کا تعارف بیان کرتے ہوئے عابدہ لال نے کافی تفصیل سے نوازا۔ واقعی اُن کی شعر و ادب کے حوالے سے بہت خدمات ہیں۔ جن کا ذکر یہاں ممکن نہیں۔ انہوں نے اپنے کلام سے نوازا تو سب سامعین کو بہت مزا آیا۔ ہر طرف سے واہ واہ کے دونگڑے برسائے جارہے تھے۔ اس کے بعد بہت ہی پُرتکلف کھانا پیش کیا گیا۔ کباب قورمہ، پلاؤ، دہی بھلے، زردہ اور پھر سبز چائے۔ بہت مزا آیا۔ رات بھیگ رہی تھی۔ کوئی گیارہ بجے یہ شام اپنے اختتام کو پہنچی۔ دعا ہے کہ ہم سب کو اُردو زبان کی ترویج کے لئے ایسی محافل منعقد کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔

روئیداد تقریب رُونمائی کاسۂ نمناک

مرتبہ:
کلیم اللہ خان

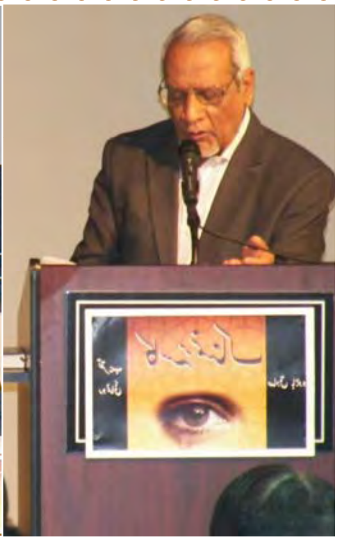

جناب صادق باجوہ کی غزلوں، نظموں اور قطعات پر مشتمل کتاب ''کاسۂ نمناک'' کی تقریبِ رُونمائی بروز ہفتہ ۷ رمئی ۲۰۱۶ء امریکہ کی ریاست میری لینڈ کے شہر بالٹیمور میں منعقد ہوئی۔ پہلے یہ تقریب ۹ رجنوری ۲۰۱۶ء کو ہونی تھی لیکن برفباری کے سبب اسے ملتوی کرنا پڑا۔ ۷ رمئی کو بھی میری لینڈ اور ورجینیا میں بیک وقت دیگر تقریبات بھی ہو رہی تھیں لیکن منتظمین نے اس مرتبہ تقریب رونمائی کو معرضِ التوا میں ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ تقریب ''مالا''

(MAALA=Mid-atlantic Literature Appreciation)

Association for

جو واشنگٹن میٹرو پولیٹن کی اہم ادبی تنظیم ہے کے تحت منعقد ہوئی۔ اس کے روحِ رواں ''مالا'' کے چیف کوآرڈینیٹر جناب ناصر جمیل اور ایک اہم رکن جناب اکرم ثاقب تھے۔ یہ تقریب رات ۹ بجے شروع ہو کر نصف شب کو اختتام پذیر ہوئی۔ اس تقریب کے دو حصے تھے۔ پہلے حصے میں صادق باجوہ کی کتاب کی رونمائی ہوئی۔ دوسرے حصے میں مشاعرہ ہوا۔ دونوں پروگرام بغیر وقفے کے جاری رہے۔ دونوں پروگراموں کی صدارت معروف اور بلند پایہ شاعر جناب باقر زیدی نے کی اور جناب اکرم ثاقب نے نظامت کے فرائض سر انجام دیے۔ جناب ساجد رضوی جو بین الاقوامی مشاعروں کی نظامت کرنے والے مشہور شاعر ہیں مہمانِ خصوصی تھے۔

پروگرام کا آغاز تلاوت قرآن کریم اور ایک فارسی نعت سے ہوا۔ جناب ڈاکٹر فہیم یونس قریشی نے حاضرین اور شعرائے کرام کو خوش آمدید کہا اور تقریب رونمائی کے التوا کے بعد انعقاد پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اس کی کامیابی کی دعا کی۔ پھر جناب ناصر جمیل نے تقریب کی اہمیت واضح کی۔ انہوں نے ''مالا'' کی کارکردگی کا مختصر ذکر کیا۔ صادق باجوہ کی شخصیت و شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کاسۂ نمناک کی اشاعت پر انہیں مبارکباد پیش کی نیز تقریب میں شرکت کرنے پر شعرا کرام اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ مئی کے مہینے کی مناسبت سے جناب اکرم ثاقب نے اپنے قریبی دوست ڈاکٹر مہدی علی شہید کا ذکرِ خیر کر کے ان کی یادوں کو تازہ کر دیا۔ مہدی علی کو ۲۶ رمئی ۲۰۱۴ء کو پاکستان میں شہید کیا گیا تھا۔ وہ ''مالا'' کے سرگرم رکن تھے۔ ان کی شہادت پر ''مالا'' نے اپنے اجلاس میں ان کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک تعزیتی قرارداد بھی پاس کی تھی۔ اس کے بعد اپنے مقالے میں جناب اکرم ثاقب نے صادق باجوہ کی شاعری کا تجزیہ پیش کیا اور بتایا کہ صادق باجوہ کے پہلے مجموعہ کلام میزانِ شناسائی کی اشاعت کے بعد تھوڑی ہی مدت میں کاسۂ نمناک کی اشاعت حیرت کی نہیں تعریف کی بات ہے۔ بقول ان کے صادق باجوہ بیان کی پیچیدگیوں میں الجھنے کی بجائے نہایت شائستہ زبان میں سادگی سے مافی الضمیر ادا کر دیتے ہیں اور قاری محسوس کرتا ہے کہ یہ تو اس کے دل کی آواز ہے۔ انہوں نے کاسۂ نمناک سے منتخب اشعار پیش کیے۔ جن میں سے دو اشعار یہ تھے:

ہوتا ہے خونِ دل سے منور یہ راستہ
صادق لہو کے دیپ جلا کر تو دیکھنا
مل جاتا ہے جب چاہے کوئی دل سے کسی کو
معبد ہو، کلیسا ہو، کہ مسجد ہو یا مندر

اکرم ثاقب کے بعد جناب آغا شاہد خان نے صادق باجوہ کی شخصیت اور شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پھر جناب نسیم فروغ نے صادق باجوہ کی شاعری پر اپنی تازہ نظم سنائی جس کے تین اشعار ہدیۂ قارئین ہیں:

یہ جو میزانِ شناسائی ہے میزانِ غزل
اس کے اک اک شعر کی تاثیر دل تک جائے گی
صادقِ فکرِ رسا کی شاعری آنکھوں کی ہے
کاسۂ نمناک کی تحریر دل تک جائے گی
شاعری سے اپنے یہ درسِ وفا دیتا رہا
نام صادق ہے تو یہ تاثیر دل تک جائے گی

بعد ازاں جناب ساجد رضوی نے صادق باجوہ کی شاعری ان شخصیت اور کاسۂ نمناک کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے بہت مؤثر تجزیہ پیش کیا۔ انہوں نے صادق باجوہ کے

چند اشعار تنقیدی نظر سے دیکھتے ہوئے ان کی تشریح بھی کی جسے حاضرین نے بہت پسند کیا۔خصوصیت سے یہ شعر یقیناً قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

جانے کیا سرگوشیوں میں کہہ گیا
آئینہ جب بھی ہوا ہے رُوبرو

تقریب کے صدر جناب باقر زیدی نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ میں صادق باجوہ کی کتاب کی رونمائی میں شرکت کر رہا ہوں۔اپنی گھریلو ذمہ داریوں اور معاشی مصروفیات کے باوجود تھوڑی مدت کے بعد دوسری کتاب کا منظرِ عام پہ آنا خوشکن خبر ہے۔صادق باجوہ کہنہ مشق غزل گو شاعر ہی نہیں ایک ہمدرد انسان اور مخلص دوست بھی ہیں اور واشنگٹن میٹروپولیٹن مشاعروں کی رونق ہیں۔ان کی شاعری کا سفر اچھے سے بہتر کی جانب رواں دواں ہے۔ایک اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے کاسۂ نمناک کی غزلوں میں صحتِ زبان کا بہت خیال رکھا ہے۔غزلوں میں خوبصورت شعر بہت ہیں جو قاری کو مزید پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ان کی محبت اور خلوص ہم سب کو یہاں کھینچ لایا ہے۔میں ان کو کاسۂ نمناک کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔امید ہے یہ کتاب بھی ادبی حلقوں میں مقبولیت کی سند حاصل کرے گی۔اس کے بعد جناب باقر زیدی نے مالا کی طرف سے صادق باجوہ کو پھول پیش کئے اور کاسۂ نمناک کی رونمائی عمل میں آئی۔اس موقع پر ان کی نواسی عنائیہ وِرک نے بھی انہیں تحفہ دے کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔صادق باجوہ نے اپنی غزلوں سے چیدہ چیدہ اشعار حاضرین کی نذر کئے۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اک بار نظر میں جو سما جاتا ہے کوئی
پھر آنکھ تو لگتی ہی نہیں آنکھ لگا کے
میں فردِ جرم بھی تسلیم کر تو لوں صادق
مجھے خبر تو ہو کب ہوگئی خطا کوئی
منزل ملے، ملے نہ ملے جستجو تو ہے
دل میں وصالِ یار کی اک آرزو تو ہے

ہم کھو چکے تھے مدتوں سے اپنے آپ کو
جانے کہاں سے آپ ہمیں ڈھونڈ لائے ہیں
چاہے کہیں بھی جایئے در کوئی کھٹکھٹایئے
سنگِ حبیب چھوڑ کے جھکتی نہیں کہیں جبیں

بعدازاں بغیر وقفے کے مشاعرہ شروع ہوا جس میں اکرم ثاقب، نعیم لغمانی، ناصر جمیل، آغا شاہد خان، شفیق خلش، صادق باجوہ، نسیم فروغ، ساجد رضوی اور باقر زیدی نے اپنے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔دو شعرا نے اردو کلام کے علاوہ اپنا پنجابی اور ہندکو کلام بھی پیش کیا۔یہ دلچسپ اور دیرپا تاثرات کی حامل تقریب نصف شب کو فوٹو سیشن کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔اس تقریب میں میری لینڈ ورجینیا، واشنگٹن ڈی سی اور پنسلوینیا سے شعروسخن کے شائقین احباب وخواتین نے شرکت کرکے تقریب کو کامیاب کیا اور اپنے ہمراہ خوشگوار یادیں لے کر لوٹے جس کا اظہار انہوں نے منتظمین سے بھی کیا۔

تبصرہ کتب

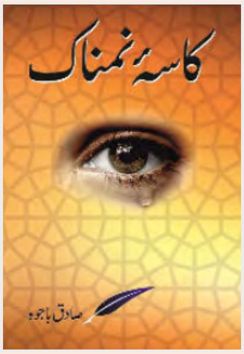

نام کتاب : کاسۂ نمناک
(غزلوں، نظموں اور قطعات کا مجموعہ)
مصنف : صادق باجوہ
ٹائٹل : رنگدار
شائع کردہ :
Unitech Publications
Punjab-146316, INDIA
e-mail: khursheedkhadim@gmail.com
krishanahmad2@gmail.com
contact: 0094-9815617814, 9872341117

افریقی مسلمانوں کا مخمصہ

زبیر خلیل خان (کروشیا)

افریقی ملک کیمرون کے احمد تیجانی (Ahmed Tijani) جنھوں نے دس سال قبل اہل سنت مسلک کو خیر باد کہہ کر شیعہ مسلک اختیار کیا تھا کہتے ہیں کہ انھیں شیعہ مسلک میں اصل اسلام کی جھلک زیادہ نظر آتی ہے۔مسلک کی تبدیلی کے بعد احمد تیجانی سال 2012 میں سرکاری خرچ پر ایران گئے اور اب کیمرون میں شیعہ کمیونٹی کے نیشنل سطح کے لیڈر کے طور پر اُبھرے ہیں۔ملک میں شیعہ مسلک کے فروغ ک لیے انھوں نے شہر Yaounde میں ایک اسکول Ahl ul Bayt Linguistic Center بھی قایم کرلیا ہے اور اسکول کا دورہ کرنے والوں کو بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ اب تک ان کی کاوشوں سے کتنے سنی مسلم اپنا مسلک تبدیل کر کے شیعہ مسلک اختیار کر چکے ہیں۔ملک کیمرون کے دارالحکومت میں میں انھوں نے ایک شاندار دفتر بھی بنا رکھا ہے جس میں ایران کا پرچم اور ایرانی لیڈر آیت اللہ خمینی کا پورٹریٹ بھی آویزاں کر رکھا ہے۔

چند دہائیاں قبل افریقہ میں مسلمانوں میں فرقہ پرستی بہت کم تھی۔اس خطہ میں اسلام کو متعارف کرانے والے بیشتر سنی مسلمان لبنان اور برصغیر ہندو پاک سے آنے والے احمدیہ اور دیگر مسلک کے مسلمان تھے۔اکثریت کا عقیدہ اہل سنت اور کسی حد تک احمدیہ عقاید تھے۔تاہم گذشتہ چند سالوں سے ایرانی کاوشوں نے بہت سارے اہل سنت مسلمان کو اہل تشیع بنا دیا ہے۔اور اب ایسا لگتا ہے کہ جیسے انیسوی صدی کے آغاز میں جنوبی عراق کے قبایل نے شیعہ مسلک اختیار کیا تھا وہی تاریخ اب افریقہ میں دُہرائے جانے کی تیاری کی جارہی ہے۔افریقہ میں شیعہ مسلک اختیار کرنے والوں کی کل تعداد کا تعین گو مشکل ہے لیکن PEW کے تازہ ترین سروے کے مطابق نائیجیریا کے 90 ملین مسلمانوں میں سے 12٪ مسلمانوں نے اپنے آپ کو شیعہ مسلک کا مسلمان رجسٹرڈ کرایا ہے۔حالانکہ اسی ملک میں سال 1980 تک شیعہ مسلک کے مسلمان موجود نہ تھے۔اسی طرح ملک چاڈ میں شیعہ مسلک کی تعداد آبادی کا 21٪ تنزانیہ میں 20٪ اور گھانا میں یہ تعداد 8٪ تک چلی گئی ہے۔

تجزیہ کے مطابق مسلک کی تبدیلی کی بڑی وجہ ملک سعودی عرب کی وہ پالیسیاں ہیں جنکے تحت وہ یمن۔شام۔اور بحرین میں شیعہ مسلک کے خلاف جارحانہ مسلح کاروائیاں کر رہا ہے۔گو سعودی عرب اور ایران کی کاوشوں کا اصل محور مشرق وسطیٰ میں کنٹرول حاصل کرنا ہے لیکن School of Advanced International Studies of Johns Hopkins University کے ڈین ولی ناصر کے مطابق افریقہ میں شیعہ مسلک کے پھیلاو سے ایران کو یہ اختیار مل سکتا ہے کہ وہ دنیاے اسلام کے ترجمان کے طور پر کردار ادا کر سکے۔

افریقہ میں سعودی عرب بعض ممالک کو اپنا ہمنوا بنانے میں کسی حد تک کامیاب ہوا ہے۔مثلاً سوڈان نے یمن میں ایران کے حمایت یافتہ حوتی قبایل کے خلاف لڑنے کے لیے اپنی فوج سعودی عرب کی کمان میں دے دی ہے۔

ایک تجزیہ کے مطابق نائیجیریا کے عوام امام خمینی کے ایرانی انقلاب کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ انقلاب کے بعد ایران میں کس طریق سے انصاف کا بول بالا ہوا۔تمام انسانوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا گیا۔اس کے برعکس نائیجیریا میں شیعہ مسلک اختیار کرنے والوں کے ساتھ ظلم ستم کا بازار گرم کیا گیا۔موجودہ صدر جو کہ سنی مسلمان ہیں انھوں نے بھی شیعہ مسلک کے مسلمانوں پر ظلم روا رکھا ہوا ہے۔اس کے علاوہ بوکوحرام شدت پسند تنظیم جو کہ سعودی اسلامی نظریات کی حامل ہے اس کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے بھی نائیجیرین مسلمانوں کا رُجحان شیعہ مسلک کی طرف بڑھ رہا ہے۔

بنیادی طور پر افریقی مسلمان Mystical Sufism نظریات رکھتے ہیں اور مذہب کی بنا پر تشدد سے نفرت کرتے ہیں۔سعودی برانڈ اسلام کے سخت نظریات اور اہل سنت عقائد رکھنے والی بوکوحرام کی چیرہ دستیوں کے باعث لوگ سنی عقیدہ کو خیر باد کہہ کر شیعہ مسلک کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔اور اس ساری کاوش میں ایران اپنے بھرپور وسائل کے ساتھ میدان میں کود پڑا ہے۔اور ہر میدان میں خرچ کے ساتھ ساتھ پروپیگنڈہ کے میدان میں بھی بے انتہا کاوشیں کر رہا ہے۔

احمدیہ مسلک جس کا بنیادی مقصد بنی نوع انسان کو اپنے خالق کی طرف رُجوع کرنے کی طرف توجہ دلانا ہے اور بنی نوع انسان کی اصل اور سچی ہمدردی پیدا کرنا ہے وہ بھی افریقہ میں بڑی کامیابیاں حاصل کر رہا ہے۔ محبت سب کے لیے اور نفرت کسی سے نہیں کے پیغام کے ساتھ چونکہ یہ ایک خالصتاً رُوحانی سلسلہ ہے اور ابھی اس جماعت کے پاس محدود وسائل ہیں اس لیے اس سلسلہ کی کامیابیاں بھی گو سست روی سے لیکن کامیابی سے جاری ہیں۔مستقبل میں براعظم افریقہ کا کیا نقشہ سامنے آئے گا اس کے لیے سب کو انتظار کرنا پڑے گا۔